طلسمات

مختصر افسانوں کا مجموعہ

عا... ... بک ڈپو لاہور

طلسمات

پروفیسر سیّد عابد علی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی،

ناشر

ن بک ڈپو ریلوے روڈ لاہور

فہرست

	انتساب	
	دیباچہ۔ پروفیسر ڈاکٹر بھوپال سنگھ ایم۔اے، ڈی لٹ، صدر شعبۂ ادبیات انگریزی، دیال سنگھ کالج لاہور۔	ا تا د
۱	داغِ ناتمام	۱
۲	شبابِ تازہ	۱۲
۳	بہار	۴۵
۴	تی کرن کپور	۵۹
۵	شب نگار بنداں	۷۵
۶	عدالت	۹۱
۷	لاہور کی ایک رات	۹۹
۸	سنیما میں ایک شام	۱۰۹
۹	جوانی کی پہلی محبت	۱۲۱
۱۰	عشرت باقی	۱۴۱
۱۱	قسمت اور خطوطِ رنگین	۱۶۷
۱۲	مسافر	۱۸۱
۱۳	منگنی	۲۰۱
۱۴	محبت کی ایک شام	۲۰۷
۱۵	صبح و شام	۲۲۵

انتساب

"ذرا بیٹھئے"

"مجھے کالج جانا ہے، دیر ہو جائیگی"

"ذرا بیٹھو"

"آج کیا کالج سے دیر نہیں ہو گی؟"

پیاری! وقت کسی پر رحم نہیں کرتا، ایک دن وہ آئیگا جب تمہارا شمار بڑی بوڑھیوں میں ہوگا، تمہارے چہرے پر سعادت کا نور ہوگا، آنکھوں میں جلال کا رنگ لیکن تمہارا جی چاہیگا۔ کہ کبھی اس الھڑ کمسن لڑکی کی شکل دیکھ سکو جس نے مجھے کالج جانے سے روکا تھا، یہ کتاب تمہیں اس کھلنڈری لڑکی کی تصویر دکھائیگی، تم میری کتاب اٹھاؤ گی اور تمہاری نظروں کے سامنے، وہ امنگ بھرا زمانہ آجائیگا، اور تم محسوس کرو گی، کہ دنیا میں ایک دل ہے جو تمہارے لئے دھڑکتا تھا، اور اب بھی صرف تمہارے لئے دھڑکتا ہے

عابد علی

دیباچہ

چھوٹی کہانی جسکو انگریزی میں شارٹ سٹوری کہتے ہیں مغرب سے ہمیں ورثہ میں ملی ہے یوں تو چھوٹی کہانیوں کا رواج ہمارے ملک میں بہت پرانے زمانے سے چلا آتا ہے۔ مگر وہ کہانی جس کو اصلی معنوں میں چھوٹی کہانی کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی تعلیم ہی کا نتیجہ ہے اصطلاحی زبان میں چھوٹی کہانی ایک چھوٹے افسانے یا قصّے یا ناول کا نام نہیں ہے، اگر ہم کسی ناول یا افسانے کا اختصار کر دیں تو چھوٹی کہانی نہیں بن جائیگی، چھوٹی کہانی لکھنا ایک الگ فن ہے یہ ایک قسم کا ادبی پھول ہے۔ اس کی خوشبو اور پھولوں سے نرالی ہے۔ اس فن کا آغاز انیسویں صدی کے شروع میں امریکہ میں ہوا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی، امریکہ کا طرز معاشرت مغربی اور خاصکر ہندوستانی طرز معاشرت سے جدا ہے۔ اگر ہماری زندگی کی رفتار بیل گاڑی کی مانند ہے، تو امریکہ والوں کی فی گھنٹہ سو میل چلنے والی موٹر کی طرح ہے امریکہ کے لوگوں کو فرصت کم ملتی ہے، ان کے پاس اتنا وقت کہاں کہ بڑے بڑے افسانے اور ناول پڑھیں، شارٹ سٹوری یا چھوٹی کہانی ایسے ہی ملک کی اختراع ہے اور ایسے ہی لوگوں کی تفریح طبع کے لئے ایجاد ہوئی تھی۔ اس کا بانی ایڈگر ایلن پو نامی ایک

امریکن مانا جاتا ہے، عابد صاحب کی مانند اس مصنف میں دو خوبیاں موجود تھیں، وہ شاعر بھی تھا اور ناثر بھی چھوٹی کہانیاں لکھ کر پو نے بڑا نام پیدا کیا۔ علاوہ اس کے اس نے چھوٹی کہانی لکھنے کے فن کی بابت جو کچھ لکھا ہے، وہ آج تک عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، چھوٹی کہانی لکھنا ہنسی کھیل نہیں۔ بڑی محنت۔ غور اور فکر کے بعد پڑھنے کے قابل کہانی لکھی جاتی ہے۔ اس کی ساخت ایک خوبصورت عمارت کی طرح ہے۔ عمارت بنانے سے پہلے انجینئر اپنے دماغ میں عمارت کا نقشہ بناتا ہے۔ اس کے ذہن میں ہوتا ہے کہ کس جگہ کتنا مصالحہ اور کیا کیا چیزیں استعمال کرنی ضروری ہیں اور کیا غیر ضروری۔ اور وہ عمارت کو شروع کرنے سے پہلے ہی سوچ لیتا ہے۔ کہ اسے ختم کس طرح کرنا ہے۔ انجینئر کی مانند کہانی شروع کرنے سے پہلے مصنف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کہانی کیا شکل اختیار کریگی اور ختم کیونکر ہوگی۔ ادبی عمارت کا نقشہ بنانے کے لئے قوت متخیلہ کو کام میں لانا پڑیگا اور محنت کرنی پڑیگی ہمارے ملک کے بہتیرے افسانہ نگار محنت سے جی چراتے ہیں۔ اٹکل پچو چھوٹی کہانی شروع کر دیتے ہیں اور جو کہانی کی شکل بن جائے۔ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

چھوٹی کہانی کے پرکھنے کا ایک اصول ہے، جس کو انگریزی میں UNITY OF IMPRESSION یا یگانگی اثر کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کہانی پڑھ کر ہمارے دل پر ایک اثر پڑتا ہے یا بہت سے اثرات اگر کہانی ایک سے زیادہ جذبات یا اثرات پیدا کرے۔ تو

جان لینا چاہیئے کہ کہانی بطورِ فن کے اچھی کہانیوں میں شمار نہیں ہو سکتی۔ کہانی کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو مگر خوبصورتی کے معیار سے گر گئی ہے معترض شاید کہے کہ خوبصورتی اور دلچسپی دو متضاد چیزیں نہیں مانا مگر جداگانہ ضرور ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دلچسپ کہانیاں خوبصورت نہیں ہوتیں۔ ہمارے ملک کا تو کہنا ہی کیا۔ امریکہ اور انگلستان میں بھی بہت سے فسانہ نگار بسا اوقات فن اور خوبصورتی کی پروا نہیں کرتے ہیں عابد صاحب کی تعریف نہیں کرتا۔ مگر حق کی بات یہ ہے کہ آپ نے کہانیاں فن کے نقطہ نگاہ سے لکھیں ہیں اور اچھی لکھی ہیں۔

عابد صاحب کے طلسمات کی سیر کر کے مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ ہمارا ملک ہر قسم کے مذہبی توہمات کا شکار ہے۔ مذہبی تعصب یا روحانیت نے جو گل ہندوستان میں کھلائے ہیں سب کو معلوم ہیں، روحانیت کی خاطر ہم نے غلامی تک قبول کر رکھی ہے روحانیت کے علاوہ ہمیں اپنے اخلاق پر بھی ناز ہے، ممکن ہے کہ ناز بجا ہو، مجھے اس سے بحث نہیں، رونا اس بات کا ہے کہ مذہب، روحانیت اور اخلاق ادبی دنیا میں بھی گھس گئے ہیں اور اس بُری طرح کہ نکالے نہیں نکلتے، ادبی فن کو مذہب، روحانیت اور اخلاق کے ترازو میں تولا جاتا ہے، جب میں اپنے تعلیم یافتہ دوستوں کی زبانی سنتا ہوں کہ فلاں کہانی۔ فلاں ڈرامہ یا فلم دھا کہ ہے یا اخلاق اور روحانیت سے پُر ہے تو مجھے خیال

کر کے رنج ہوتا ہے کہ سیاسی سوراج کی طرح ہمارا ادبی سوراج بھی ابھی کوسوں دور ہے۔ ہر ایک ملک اور زمانے کا اخلاق مختلف ہے، بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہیگا، مگر خوبصورتی ایک اٹل چیز ہے خوبصورتی کے پروانے مذہب و ملت رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں ایک غزل یا افسانے کو اخلاقی، روحانی یا مذہبی نظر سے دیکھنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ ایک پھول سے ہم پوچھیں کہ تیرا مذہب کیا ہے اور تیرے پیدا ہونے کا راز کیا ہے، اور تو اپنی خوشبو اور خوبصورتی کو بے شرمی سے باغ میں کیوں بکھیر رہا ہے۔ عابد صاحب ہمت والے آدمی ہیں، اور نڈر۔ اپنے طلسمات میں برملا کہتے ہیں، کہ میں تو آرٹسٹ یا فنِ ادب کا پجاری ہوں، خوبصورتی میری ملکہ ہے۔ اور زندگی ایک ڈرامہ ہے، اگر اس زندگی کی نورانی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں تو میرے طلسمات میں داخل ہو جائیے، ورنہ خدا حافظ۔

ڈرتے ڈرتے میں نے کتاب کا دیباچہ لکھا ہے پروفیسر عابد علی سے میں نہیں ڈرتا میرے پرانے دوست اور مہربان ہیں، مگر عابد صاحب سے ضرور گھبراتا ہوں۔ شاعر اور انشا پرداز کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتے، جادوگر ہوتے ہیں اور جادوگروں سے راہ و رسم ٹھیک نہیں۔ پھر بھی میں دیباچہ لکھنے کو تیار ہو گیا۔ یہ اس خیال سے کہ عابد صاحب کا نام علم و ادب کے فلک پر ستارہ بنکر چمکیگا۔ شاید دیباچہ کے بہانے سے میرا بھی نام رہ جائے اور گلفام کے ساتھ ساتھ میں بھی راجہ اندر کے ادبی اکھاڑے میں داخل ہو جاؤں۔

بھوپال سنگھ نکلسن روڈ لاہور۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء

داغِ ناتمام

شباب ختم ہوا، اضطراب ختم ہوا
کتابِ زیست کا ایک اور باب ختم ہوا

داغ ناتمام

اُسے یاد نہیں وہ کتنی دیر وہاں کھڑا کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اللہ وہ دلربا صورت پھر نظر آئے گی۔ یا وہ نشتر جو دل میں چبھ رہا ہے۔ اسی طرح چبھتا رہے گا۔؟ انتظار کی ایک گھڑی غم واندوہ کے ایک ایک سال کے برابر معلوم ہوتی تھی۔ اُسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ شاید وہ ازل سے یہیں کھڑا تھا۔ سامنے کا مکان اب اسے کتنا اداس نظر آتا تھا پرانی وضع کا ایک نہایت وسیع مکان تھا۔ سامنے ایک پیری کا درخت جس کے سائے میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ یہ منظر اسے خواب کا منظر معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ جاگ پڑے گا اور ہر ایک چیز ماضی کے کہرے میں اس طرح گم ہو جائے گی۔ گویا اسکا وجود ہی نہ تھا! اسی مکان کی مشرقی دیوار کی ایک کھڑکی میں اسے ایک حسین لڑکی کا چہرہ نظر آیا تھا۔ "حسین" اس نے یہ لفظ اپنے دل میں کئی دفعہ دہرایا۔ حُسن کے ظاہری معیار سے جانچا جائے۔ تو وہ اتنی حسین بھی تو نہ تھی لیکن وہ اپنے آپ کو مسحور پاتا تھا۔ آنکھیں سیاہ یا شاید سیاہی مائل بھوری۔ اور ان میں کسی غم کا اثر۔ ان آنکھوں کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی کچھ غمگین

اور اداس نظر آتا تھا۔ اور ہونٹوں کا وہ خوبصورت اور دردناک خم گویا چپکے چپکے رو رہی ہے اور ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ ان ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم ہو تو کیا ہو؟ شاید کائنات بے اختیار مسکرانے لگے؛

کھڑکی کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں تھک گئیں۔ کھڑکی اسی طرح بند تھی وہ سمجھنے لگا کہ شاید اس کی آرزوؤں نے ایک جیتی جاگتی خوبرو لڑکی کی شکل اختیار کر لی ہے شاید اُس نے کھڑکی میں کسی کو نہ دیکھا تھا؛

اسے یاد نہیں وہ کب تک کھڑا رہا۔ لیکن رات کو جب اس نے بستر پر لیٹ کر آسمان پر جھلملاتے ہوئے تاروں کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ اُسے اپنے دل میں ایک چبھن سی معلوم ہوئی۔ جہاں وہ لیٹا تھا۔ وہاں سے اس مکان کی ایک دیوار نظر آتی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ اس مکان میں اس دیوار کے پیچھے کہیں ایک خوبرو لڑکی ——— وہ کیا کر رہی ہوگی۔؟ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ شاید وہ بھی تاروں کو دیکھ رہی ہو۔ شاید رو رہی ہو۔ یہ سوچکر اس کا دل بیتاب ہوگیا۔ وہ بستر سے اُٹھ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا شدت آرزو سے اپنی نگاہیں دیوار کے اس پار پہنچا دیگا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی آنے لگی۔ دیوار کبھی گم ہو جاتی تھی۔ کبھی پھر ظاہر ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس کے پاس بائیں طرف اس کا دوست جس کی شادی پر وہ برات کے ساتھ پانچسو میل کا سفر کر کے آیا تھا۔ سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسقدر پرسکون تھا۔ اس کے دوست نے نیند میں کروٹ لی۔ اور اٹھ کر سرہانے جو صراحی رکھی تھی۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پانی پینے کے بعد مڑ کر اس کی طرف دیکھا پھر چونک کر پوچھا۔

"تم کیا کر رہے ہو اصغر؟"

اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا:۔

"میں جاگ رہا ہوں نیاز! تم سو جاؤ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے نیند نہ آتی تھی اس لئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔"

نیاز پھر لیٹ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں سو گیا۔

اس نے اپنے دل میں سوچنا شروع کیا۔ کہ نیاز کتنا شریف انسان ہے اور اسکی زندگی کتنی پُرسکون ہے۔ میں اگر اس سے پوچھوں۔ کہ سامنے کے مکان میں کون رہتا ہے، تو کیا ہوگا۔ کسی کو ایک بار دیکھنے کے بعد دل کی یہ حالت بھی ہو جاتی ہے۔؟ کسی کو دل اتنی شدت سے بھی چاہتا ہے؟ کل شام کو نیاز کے ساتھ میں واپس چلا جاؤں گا۔ اور پھر شاید کبھی اس شہر میں آنا نہ ہوگا۔ لیکن وقت ان تاثرات کو نہیں مٹا سکتا جو ان ہونٹوں کے دردناک خم نے پیدا کر دئے ہیں؛ وہ تو یہ چاہتا تھا، صرف یہ چاہتا

اور اداس نظر آتا تھا۔ اور ہونٹوں کا وہ خوبصورت اور دردناک خم گویا چپکے چپکے رو رہی ہے اور ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ ان ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم ہو تو کیا ہو؟ شاید کائنات بے اختیار مسکرانے لگے۔

کھڑکی کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں تھک گئیں۔ کھڑکی اسی طرح بند تھی وہ سمجھنے لگا کہ شاید اس کی آرزوؤں نے ایک جیتی جاگتی خوبرو لڑکی کی شکل اختیار کر لی ہے شاید اُس نے کھڑکی میں کسی کو نہ دیکھا تھا۔

اسے یاد نہیں وہ کب تک کھڑا رہا۔ لیکن رات کو جب اس نے بستر پر لیٹ کر آسمان پر جھلملاتے ہوئے تاروں کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ اُسے اپنے دل میں ایک چبھن سی معلوم ہوئی۔ جہاں وہ لیٹا تھا۔ وہاں سے اس مکان کی ایک دیوار نظر آتی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ اس مکان میں اس دیوار کے پیچھے کہیں ایک خوبرو لڑکی ——— وہ کیا کر رہی ہوگی۔؟ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ شاید وہ بھی تاروں کو دیکھ رہی ہو۔ شاید رو رہی ہو۔ یہ سوچکر اس کا دل بیتاب ہوگیا۔ وہ بستر سے اُٹھ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا شدت آرزو سے اپنی نگاہیں دیوار کے اس پار پہنچا دیگا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی آنے لگی۔ دیوار کبھی گم ہو جاتی تھی۔ کبھی پھر ظاہر ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس کے پاس بائیں طرف اس کا دوست جس کی شادی پر وہ برات کے ساتھ پانچسو میل کا سفر کر کے آیا تھا۔ سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسقدر پرسکون تھا۔ اس کے دوست نے نیند میں کروٹ لی۔ اور اٹھ کر سرہانے جو صراحی رکھی تھی۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پانی پینے کے بعد مڑ کر اس کی طرف دیکھا پھر چونک کر پوچھا۔

"تم کیا کر رہے ہو اصغر؟"

اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا:۔

"میں جاگ رہا ہوں نیاز! تم سو جاؤ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے نیند نہ آتی تھی اس لئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔"

نیاز پھر لیٹ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں سو گیا۔

اس نے اپنے دل میں سوچنا شروع کیا۔ کہ نیاز کتنا شریف انسان ہے اور اسکی زندگی کتنی پُرسکون ہے۔ میں اگر اس سے پوچھوں۔ کہ سامنے کے مکان میں کون رہتا ہے، تو کیا ہوگا۔ کسی کو ایک بار دیکھنے کے بعد دل کی یہ حالت بھی ہو جاتی ہے۔؟ کسی کو دل اتنی شدت سے بھی چاہتا ہے؟ کل شام کو نیاز کے ساتھ میں واپس چلا جاؤں گا۔ اور پھر شاید کبھی اس شہر میں آنا نہ ہوگا۔ لیکن وقت ان تاثرات کو نہیں مٹا سکتا جو ان ہونٹوں کے دردناک خم نے پیدا کر دئے ہیں؛ وہ تو یہ چاہتا تھا، صرف یہ چاہتا

تھا۔ کہ ایک باران ہونٹوں پر تبسم دیکھ لے۔ کتنی معمولی سی بات تھی اور کتنی مشکل۔
اسی ادھیڑبُن میں تارے ٹمٹمانے لگے۔ اسے اپنا جوڑ جوڑ دکھتا ہوا محسوس ہوتا تھا
سر میں شدت سے درد ہو رہا تھا!

دوسرے دن وہ صبح کے وقت نیاز کی آنکھ بچا کر پھر وہیں جا کھڑا ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ ایک بار اس خوبرو لڑکی کو معلوم ہو جائے کہ دنیا میں ایک شخص ہے جو صرف اس کو چاہتا ہے۔ ایک دل ہے۔ جو صرف اس کیلئے دھڑکتا ہے۔ ایک پیکر ہے۔ جس میں اسی کی محبت کی روح ہے۔ کئی بار اسے خیال آتا تھا۔ کہ وہ ایک خط لکھ کر کھڑکی کے نیچے پھینک دے۔ لیکن پھر وہ سوچتا تھا۔ کہ خط میں کیا لکھے؟ جس چیز کا وہ اظہار کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک نگاہ کے ذریعے بھی ادا کی جا سکتی تھی۔ کوئی گھنٹہ بھر وہ کھڑا رہا اور پھر اسکا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اسکا وہم تھا۔ کہ سامنے مکان کی کھڑکی آہستہ آہستہ کھل رہی تھی۔ اور ایک خوبرو لڑکی کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ جسکے ہونٹوں میں ایک خوبصورت اور دردناک خم تھا!

ان دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اور لڑکی کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم ظاہر ہوا۔ اصغر کو ایسا معلوم ہوا گویا وہ جنت کے ایک سبزہ زار میں کھڑا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف ہلکی ہلکی ضیا کی بارش ہو رہی ہے۔ وہ تبسم ایک پیغام سکون بن کر

اس کے دل میں اتر گیا۔ اسکا اضطراب یکبارگی رفع ہوگیا۔ اُسے یوں معلوم ہوا کہ دنیا جو کچھ اسے دے سکتی تھی، دے چکی اب دنیا کے خزانوں میں کوئی نعمت اور کوئی مسرت باقی نہیں رہی جسکے لئے اسکا جی للچائے جسطرح کسی سنسان صحرا میں دور بانسری کی آواز دل میں ایک میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتی ہے اس تبسم نے بھی اس کے دل میں درد پیدا کر دیا تھا۔

اصغر کے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی جو اسے ایک مصری دوست نے تحفے کے طور پر دی تھی۔ نیلے رنگ کے پتھر میں ایک سانپ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے وہ انگشتری اتاری۔ اور ہاتھ کو ذرا بلند کیا۔ لڑکی نے گویا اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تیز تیز کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اور انگشتری ایک کاغذ میں لپیٹ کر نیچے پھینک دی پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کہ وہ لڑکی اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اسنے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا جسے وہ سمجھ نہ سکا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کھڑکی بند ہوگئی؛

اسی شام وہ پھر اس کھڑکی کے پاس سے گزرا۔ وہ کاغذ جس میں اسنے انگوٹھی لپیٹ کر پھینکی تھی۔ وہاں موجود نہ تھا؛

اس واقعہ کو پندرہ سال گزر گئے۔ اصغر اب زندگی کے کارزار میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ایک مصروف اور کامیاب سرجن۔ وہ لاہور سے دہلی جا رہا تھا۔ سیکنڈ کلاس کے ایک اوپر کے برتھ پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ کہ کاروانِ حیات بھی اتنا ہی تیز ہے۔ جتنی ریل اور اتنا ہی حیرت انگیز بھی۔ جس طرح ریل کے مختلف سٹیشنوں پر مختلف لوگ چڑھتے ہیں اور ان سے سرسری ملاقات ہوتی ہے۔ رسماً کچھ باتیں ہوتی ہیں۔ اور پھر وہ ہمیشہ کیلئے ہماری زندگی میں سے نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح زندگی کے مختلف مرحلوں پر مختلف آدمیوں سے ہم کچھ عرصہ کیلئے ملتے ہیں۔ گویا ریل کا سفر بھی زندگی کے سفر کا ایک نمونہ ہے۔ یہ سوچتا ہوا وہ سو گیا۔ انبالے کے سٹیشن پر گاڑی رکی اور اس کی آنکھ کھلی تو اس نے سنا کہ اس کے کمپارٹمنٹ کے دروازے کے پاس کوئی کہہ رہا تھا:۔

"زنانہ درجوں میں تو بہت بھیڑ ہے یہیں نہ بیٹھ جائیں؟"

اس فقرے کا جواب اصغر نے نہیں سُنا ایک دو منٹ کے بعد دو قلیوں نے سامان اندر رکھا۔ اور پھر ایک مرد ایک عورت اور تین بچے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے؛ مرد نے نچلی تین سیٹوں پر بستر بچھایا۔ اصغر کے مقابل کی سیٹ پر عورت ایک بچے کو لیکر بیٹھ گئی۔ وہ برقعے میں تھی۔ لیکن نچلی سیٹیں بالکل خالی تھیں۔ اور یہ سمجھ کر کہ اس کمرے میں کوئی مرد نہیں۔ اس نے اپنا برقعہ اتار لیا؛

اصغر نے دیکھا کہ وہ ایک گورے رنگ کی بھاری بھرکم عورت تھی۔ کوئی تیس سال کی معمولی شکل وصورت دو بچّوں کو اس نے تھپک کر ایک سیٹ پر سلادیا اور پھر خود سامنے کی سیٹ پر لیٹ گئی۔ مرد منہ میں سگار لئے اخبار پڑھ رہا تھا۔

اصغر سو گیا۔ کوئی دو گھنٹہ کے بعد اٹھا۔ اسکا گلا خشک ہو رہا تھا۔ پانی پینے کیلئے نیچے اترا۔ ریل کی آواز کے سوا کمرے میں اور کمرے کے باہر بالکل خاموشی تھی اصغر نے دیکھا۔ کہ عورت پہلو کے بل سو رہی تھی۔ اسکا ہاتھ سیٹ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اور درمیانی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی، جسکے نیلے رنگ کے پتھر میں ایک سانپ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اصغر کو گویا یہ معلوم ہوا کہ وہ غش کر جائیگا۔ اسی جگہ کھڑا کھڑا وہ اس شہر میں پہنچ گیا۔ جہاں آج سے پندرہ سال پہلے ایک خوبرو لڑکی کا چہرہ نظر آیا تھا!

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر عورت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چہرے کے وہ نقوش جن پر وقت نے ظلم کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تحلیل ہونا شروع ہوئے اور اُسے ایک حسین لڑکی کا چہرہ نظر آیا۔ جس کی آنکھیں سیاہ شاید سیاہی مائل بھوری تھیں۔ اور جس کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت اور دردناک خم تھا۔ گویا چپکے چپکے رو رہی ہے۔ اور ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ سامنے آئینے میں اُسنے اپنا چہرہ دیکھا ماتھے

پر شکن، آنکھوں کے قریب جھریاں۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ کہ میں نے پندرہ سال پہلے کی لڑکی کو صرف انگشتری کی مدد سے پہچانا۔ لیکن اسے میری بگڑی ہوئی شکل میں وہ نوجوان کیسے نظر آئے گا جسے پندرہ سال پہلے وہ دیکھ کر مسکرائی تھی؛

وہ ابتک مجھے وہی نوجوان سمجھتی ہوگی۔ یہ سوچکر وہ آئینے کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہونی شروع ہوئی۔ عورت نے کروٹ لی۔ سٹیشن پر پہنچ کر گاڑی رکی۔ تو شور سے عورت کی آنکھ کھل گئی۔ اصغر نے فوراً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور اسی طرح شب خوابی کے لباس میں کمپارٹمنٹ سے نکل گیا۔

سٹیشن پر لوگ حیرت سے ایک شخص کیطرف دیکھ رہے تھے۔ جو دیوانہ وار ہنستا ہوا شب خوابی کے لباس میں ننگے پاؤں دوڑا جارہا تھا۔

شبابِ تازہ

جھانکتی تھی عشق کے پردے سے مرگِ ناگہاں
عشق کو عابدؔ حیاتِ جاوِداں سمجھا تھا میں

شبابِ تازہ

ظفر نے تصویر کی طرف ایک آخری حسرت آلود نظر سے دیکھا۔ اور پھر اسے میز پر رکھدیا۔ اس انداز سے رکھدیا۔ گویا وہ اس جذبے کے تاثرات کو جو اس تصویر کے نقوش میں مضمر تھا۔ محو کر دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ ایک خود فراموش عجلت سے اٹھا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سامنے کی دیوار پر ایک قدِ آدم آئینہ آویزاں تھا۔ یکبارگی وہ اپنے عکس کو دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔ اور آئینہ کے قریب جا کر اس نے اپنے آپ کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ پژمردہ چہرہ، بے رونق اندوہگیں آنکھیں۔ گھنی مونچھوں میں کہیں کہیں سفید بال۔ وہ اس طرح اپنے آپ کو غمگین ہیئت میں دیکھ کر آج خلافِ معمول اور خلافِ توقع پریشان ہو گیا، اس سے پہلے وہ دن میں کئی دفعہ آئینہ دیکھتا تھا، لیکن تکدرِ خاطر کا یہ احساس، یہ پیشانی طبع کی یہ خلش، یہ آشفتگیٔ مزاج کا یہ رنگ، جو آج اُسے روح پر گرمی کے تاریک بادلوں کی طرح سایہ افگن معلوم ہوتا تھا۔ آئینہ دیکھ کر کبھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اور ہاتھوں سے زیادہ کانپتی ہوئی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو چھوا

گویا اپنی قوتِ ارادی کی مدد سے اُن بدنما جھرّیوں کو جو ایک پیش از وقت بڑھاپے کی نشانی ہیں۔ دور کر دیگا۔ پھر اس نے انتہائی بیتابی سے اپنے چہرے کو آئینہ کے قریب تر کیا۔ اور تخیل اس کے حافظے کو گزرے ہوئے سالوں کی رنگین یاد میں لے گیا۔ آئینہ کی سطح مدھم سی ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اور نیم وا آنکھوں سے اس نے اپنی جوانی کا شگفتہ چہرہ منعکس دیکھا۔ خوشرنگ، تازہ رو، سیاہ چمکتے ہوئے بال، جذبات کی آتشی رو کی مستقر آنکھیں، پھر آہستہ آہستہ آئینہ کی سطح صاف ہوگئی۔ اور اسے اپنا بدنما چہرہ صاف صاف نظر آیا۔ تضاد اور تقابل کے اس کریہہ اور دلخراش منظر کو دیکھ کر وہ بہت گھبرا گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر میز پر سے وہی تصویر جسے دیکھ کر وہ بیتاب ہوگیا تھا اُٹھالی۔ یہ تصویر عمر خیام کی ایک رباعی کی شاعرانہ توضیح تھی۔ جسے مصوّر نے پیکر مادی میں منتقل کر کے شعر کی رنگینیوں کو چشم ظاہر پر نمایاں کر دیا تھا۔ ایک خوبرو و خوشرو جوان اپنی نازک اندام محبوبہ کی معیت میں سیرِ باغ کر رہا تھا۔ گویا فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے، کی زبانِ حال سے تشریح کر رہا ہے آہ ایسا موقع اس کی زندگی میں کبھی پیش نہ آیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے گذشتہ دور پر ایک نظر ثانی کرنا شروع کی۔ رس بھری جوانی کے اوائل میں اس کی شامیں ہوتی تھی۔ وہ کس قدر مسرور دن تھے۔ شبِ زفاف میں وہ جس وقت کانپتے

کے اپنے جذبات کو پرجوش الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی حسیات بہت شاداب اور کامران تھیں۔ یہ رات اُسے ہزاروں روح فرسا دن کاٹنے کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ اور وہ جو ذہنی لحاظ سے ایک مکمل شاعر تھا خیال کرتا تھا۔ کہ شاید اس کی شعریت اس مونسِ حیات، اس رفیق زندگی، اس شریکِ غم، یعنی بیوی کی معیت میں بہت رنگین ہو جائے گی۔ لیکن افسوس یہ تمام توقعات مجروح ہو گئیں۔ جس طرح کوئی نازک بدن کبوتر چھروں سے مجروح ہو جاتا ہے، اس کو بیوی ملی۔ لیکن آہ کیسی بیوی ملی۔ اسے یہ امید نہ تھی۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ کہ دنیا میں کسی شخص کا زاویۂ نگاہ اس قدر تنگ اور قوتِ ذہن اتنی محدود ہو سکتی ہے جتنی اس کی بیوی کی تھی۔ شادی کے دو تین ہی ماہ بعد اسے معلوم ہو گیا۔ کہ اس کی بیوی نے ایسی فضا میں تربیت پائی ہے۔ جہاں اوامر و نواہی فضائل و رذائل اخلاق و علم، حقوق و فرائض اور محبت و شفقت کے متعلق ایسے خیال ہیں۔ جن کا اسے وہم و گمان بھی نہیں؛

اس نے پہلے اخلاص سے، پیار سے، اور بعد ازاں درشتی سے سختی سے، اپنی بیوی کو اپنا ہم مزاج بنانا چاہا۔ اور ناکامیاب رہا۔ اس کی روشن خیالی فطری جہالت کی گرانبار زنجیروں کو توڑ نہ سکی۔ اور آخر کار ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے

کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اس کی بیوی خدیجہ اپنی جہالت میں یہ سمجھ کر کہ ظفر کا فرض ہے کہ وہ اُسے منائے۔ کیونکہ اس کے خیال میں غلطی سراسر ظفر کی تھی۔ خاموش رہی۔ اور وہ یہ سمجھ کر کہ اس کی بیوی کبھی اس کی ہم خیال نہ بن سکتی تھی چپ ہو رہا۔

وہ چاہتا تھا۔ کہ جس وقت وہ دفتر سے تھکا ماندہ سُست قدموں سے گھر واپس آئے۔ تو اس کی بیوی مسکراتی ہوئی آنکھوں اور پر تپاک الفاظ سے اس کا خیر مقدم کرے۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اپنی پریشانی کو محبت کے ہجوم میں گم کر دے۔ لیکن خدیجہ ظفر کی اس آرزو سے بے خبر تھی۔ بلکہ حقیقت یوں ہے۔ کہ بے نیاز تھی۔ دن بھر وہ خانہ داری کے کاموں میں مصروف رہتی۔ اور حقیقی شرافت کا وہ معیار حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ جو اس کے والدین نے طفولیت سے اس کے ذہن نشین کر دیا تھا۔ خانہ داری کے کام سے فراغت ہوتی، تو سینا پرونا لے بیٹھتی۔ لیکن یہ ضرور تھا۔ کہ ظفر کی خدمتگزاری میں وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے زاویۂ نگاہ کے موافق، کوئی کوتاہی نہ کرتی تھی۔ وہ یہ نہ سمجھتی تھی، کہ خاوند کیلئے کھانا پکا دینا۔ اور اس کی آرام و آسائش کا خیال رکھنا ہی ایک ایسا عنصر نہیں۔ جو مرد کی محبت کو مطمئن کر سکے۔ وہ اس مرمریں بت جو مشین کی طرح اپنا تمام کام کاج کرتا تھا۔ اور جس کے منہ سے کبھی شوق کے کوئی پرجوش

الفاظ اور جس کے انداز سے زندہ دلی کا کوئی متحرک ثبوت پیدا نہ ہوتا تھا۔ انتہائے جوش سے نفرت کرنے لگا۔ ایک سال کے بعد ان کو وہ نعمت مل گئی۔ جس کا وجود گہرے سے گہرے زخم پر مرہم کا کام دیتا ہے۔ لڑکے کے پیدا ہونے سے تھوڑے عرصے کے لئے بظاہر اُوہ خلیج جوان کے دلوں کے درمیان حائل تھی۔ کچھ عرصے کیلئے کم ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ اور وہ خوش تھا۔ کہ شاید اسی معصوم روح کے وسیلے سے ان میں حقیقی صلح ہو جائے۔ لیکن یہ آرزو بھی باقی آرزوؤں کی طرح ناکام رہی۔ ان کا لڑکا امتیاز ایک سال کا ہو گیا تھا۔ اور اب خانہ داری چھوڑ کر خدیجہ دن بھر امتیاز کی غور و پرداخت میں مصروف رہتی۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا۔ جب اس کی صحت کیلئے حفظ ماتقدم کے طور پر انتظامی تدابیر عمل میں نہ لائی جا رہی ہوں۔ حالات زیادہ ناگوار ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ اب خدیجہ امتیاز کی موجودگی میں اپنے خاوند کی ہستی کو گویا بالکل فراموش ہی کر چکی تھی!

اس کا سلسلۂ خیالات یہاں تک پہنچ کر ایک لمحے کے لئے منقطع ہو گیا۔ وہ اب یہ سوچنے لگا۔ کہ فطرت کی ستم ظریفیاں بعض اوقات کس قدر مہیب اور دردناک ہوتی ہیں۔ اسے امید تھی۔ کہ ان کا لڑکا ان دونوں میں حقیقی صلح کرانے کا موجب ہوگا۔ لیکن اس کے برخلاف اسے خود اپنے بیٹے سے نفرت ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس کے وجود

کو اپنی محبت میں ایک سنگ راہ سمجھتا تھا۔ جس کی وجہ سے خدیجہ اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتی تھی۔ اُسے یاد تھا۔ کہ ایک دن جب خلافِ معمول اس کا دل رنگین جذبات سے معمور تھا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس گیا۔ اور گذشتہ واقعات کو بھلا دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اور بعد ازاں باہر سیر کو جانے کیلئے کہا۔ اس کو امید تھی۔ کہ شاید آج خدیجہ اس کو خوش کرنے کیلئے۔ ہاں کہدے گی۔ لیکن اس نے جواب دیا تھا: "سردی کے دنوں میں باہر جانا امتیاز کیلئے مضر ہوگا۔ کہیں ہوا نہ لگ جائے۔" یہ سنکر وہ اپنی بیوی سے خوب لڑا تھا۔ اور اس دن اُس نے اپنے دل کا بخار نکالا تھا۔ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ کہ اس نے جوش سے بیتاب ہو کر کہا تھا: "کیا تمہارے فرائض میں یہ فرض داخل نہیں۔ کہ تم اپنے خاوند کی دلجوئی کرو۔ کہ تم اُسے خوش رکھو کیا تمہارا خیال ہے۔ کہ ہماری بیاہتا زندگی محض کھانے پینے اور بچوں کی پرداخت کیلئے وقف ہے۔ خدیجہ کیا تم نہیں سمجھتیں کہ تم اپنے اس طرزِ عمل سے مجھے پیش از وقت بڑھاپے کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ اس کو توقع تھی کہ خدیجہ اس کا جواب ترکی بہ ترکی دے گی۔ اس سے لڑے گی۔ لیکن اس نے نہایت آہستہ سے کہا تھا: "آپ جو چاہیں کہیں میرا فرض ہے کہ میں آپ کے اس بیجا غصہ کو برداشت کروں۔"

فرض۔ فرض۔ فرض۔ ظفر آج بھی اس واقعہ کے آٹھ سال بعد اس واقعے

کی یاد کو تازہ کر کے بے بس اور اندھا دھند غصّے سے کانپ اٹھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ فرض کے لفظ کو لغت میں سے نکال دیتا۔ آہ شاید وہ یہ بھی کر لیتا لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ کہ فرض کے جو معنی اس کی بیوی نے اپنے ذہن میں جاگزیں کر رکھے تھے وہ انہیں کسی طرح نکال کر پھینک دیتا۔ اس کی جوانی کا بہترین حصہ اسی روح فرسا کشمکش میں گزر گیا۔ اور کبھی اس کے دل میں اس زندگی کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کا خیال نہ آیا۔ لیکن آج خدا جانے کیا وجہ تھی۔ کہ آج کے دن اس گھر میں جہاں اس کی بیوی نام نہاد فرض کی پابند بیوی بھی رہتی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُسے خوف تھا۔ کہ اگر وہ زیادہ عرصہ اس زہریلی فضا میں سانس لیتا رہا۔ تو پھڑک کر مر جائے گا۔ اس نے پھر ایک دفعہ تصویر کو اٹھا کر دیکھا۔ اور دل میں کہنے لگا۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو پھر حاصل کر لوں۔ ان سالوں کو جو میں نے اپنے اخلاق کے ظالمانہ قانون کی نذر چڑھا دئے ہیں۔ شادابی اور کامرانی سے بسر کر سکوں۔ وہ بہت غور تصویر کی طرف دیکھتا رہا۔ حتےٰ کہ اُسے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا تصویریں جسم میں بڑھ گئیں ہیں۔ اور تمام کمرے پر چھا گئی ہیں۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور پھر بے اختیار ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان چند لمحوں میں جب وہ آخری دفعہ تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک عظیم کشمکش برپا ہوئی۔ اور وہ اس ذہنی مجادلے کی تکلیف

سے بیتاب ہو کر ہی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن ذہنی تکلیف کے رفع ہو جانے کے بعد اب وہ مسرت کے ایک عجیب احساس سے مخمور تھا۔ کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ اس گھر کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اور اپنی برباد شدہ جوانی کی تلافی کیلئے اپنے آپ کو محبت، عشرت اور ہوس کے سمندر میں غرق کر دے گا؛

(۲)

اس نے ایک والہانہ انداز سے اپنی ٹوپی سر پر رکھی۔ چھڑی ہاتھ میں لی۔ اور نکل کھڑا ہوا۔ اب رات ہو گئی تھی۔ بازاروں میں چراغ روشن ہو گئے۔ لیکن وہ ایک عالم میں تھا۔ کہ اس کی آنکھیں ظلمت و نور میں کوئی خاص امتیاز نہ کر سکتی تھیں۔ محض کسی غیر معلوم قوتِ ادراک کی مدد سے وہ حادثات کی زد سے محفوظ چلا جا رہا تھا۔ ورنہ اس کے حواس اختلالِ باطنی کی اس کیفیت میں مبتلا تھے۔ کہ وہ کئی بار کسی تیز رفتار موٹر یا کسی بے پروا کوچبان کے تانگے کے پہیوں کے نیچے کچلا گیا ہوتا۔ یوں تو وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن ابھی اس ضروری مسئلے کو حل کرنا تھا۔ کہ آخر شبابِ تازہ حاصل کرنے کے وسائل کیا ہونے چاہئیں۔ آخر کھوئی ہوئی جوانی کی تلافی کس طرح کرنی چاہیے۔ اسی ادھیڑبن میں مصروف وہ بازاروں۔ گلیوں۔ کوچوں میں سے گزرتا ہوا شہر کے مضافات کے قریب جا پہنچا۔ تنگ اور مسموم راستوں میں سے گزرنے کے بعد ان فراخ مقامات کی

ہوا اسے بہت فرحت بخش محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ جہاں پسینے کے کچھ قطرے نمودار تھے۔ اور اس کے حواس کچھ بجا ہوئے۔ ساتھ ہی اس کی نگاہ سامنے ایک عظیم الشان عمارت پر پڑی۔ جو برقی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ وہ پہلے کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ یہ کیا مقام ہو سکتا ہے۔ پھر اس کی تمام ذہنی قوتیں یکلخت عود کر آئیں۔ اور اس کو خیال ہوا۔ کہ یہ مقام ایک شرابخانہ تھا۔ وہ بہت عرصہ کھڑا ہوا آدمیوں کے ایک جم غفیر کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ شاید وہ آتشِ سیال جس سے یہ تمام لوگ اپنے قلب و جگر کو گداختہ کرنے کیلئے اسقدر مستعد بیتابی سے ہجوم کر رہے تھے۔ اسے بھی کچھ مدد دے سکے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو گئی۔ اور اس نے اپنی رگوں میں گرم خون کو تیزی سے دوڑتا ہوا محسوس کیا۔ لیکن وہ شرافت نفس جو اتنا عرصہ اخلاق اعلیٰ کے سایے میں پرورش پا کر اس کے دماغ میں مستقل طور پر جاگزیر ہو چکی تھی۔ اس کی اضطراری خام خیالی پر غالب آگئی، وہ اس شرابخانے اس روشن آزمائش کی طرف سے منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے دل میں بے بسی کا ایک بے پناہ احساس پیدا ہوا۔ آہ۔ آخر اسے وہیں جانا پڑیگا۔ جہاں جانے سے اس کی روح گریز کرتی تھی۔ لیکن جہاں جانے پر وہ مجبور تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ پھر چل دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ منزلِ مقصود پر آپہنچا۔ وہاں جہاں حُسن خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ جہاں سونے

کی چمکتی ہوئی ٹکلیوں کی خواہش میں ظاہری پیار کے طلائی پھندے ناتجربہ کار دلوں کے لئے پھیلائے جاتے ہیں۔ جہاں ہوس کی بدترین حالت رنگین پیراہنوں میں ملبوس ہو کر خرمنِ صبر و شکیب کو پرتوِ جمال سے خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ وہ اس بازارِ حسن میں پہنچکر مبہوت و ششدر رہ گیا۔ وہ دیکھتا تھا اور کچھ نہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ سنتا تھا۔ اور اسے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ ہر طرف بالاخانوں پر، کھڑکیوں میں، چبوتروں پر حُسن کے ہجوم کو انوار کو تابش کو دیکھ دیکھ کر کچھ بیخود سا ہو رہا تھا۔ ان نہ پگھلنے والی شمعوں کے گرد نہ جلنے والے پروانوں کے ہجوم میں سے وہ بھی گزرتا ہوا چلا گیا۔ یہاں کے کاروبار کی جدت جہاں ہر شخص خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ اسے تمام دنیا سے انوکھی اور نرالی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دفعہ وہ تمام بازار کا چکر لگا چکا۔ اور اُسے خبر بھی نہ ہوئی۔ دوسری دفعہ اب وہ ذرا پہلے سے زیادہ آہستہ، پہلے سے زیادہ مطمئن انداز میں ہر ایک حُسن فروش کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ صورتیں جو پہلے اسے اپنے حیات کے وفور میں کچھ مبہم سی نظر آتی تھیں۔ اب ذرا زیادہ صاف نظر آنے لگیں۔ لیکن ابھی تک وہ نسبتاً اُن کے حُسن کے مدارج میں کوئی تفاوت، ان کے انداز میں کوئی امتیاز، ان کے طریقِ نشست و برخاست میں کوئی فرق نہ کر سکتا تھا۔ اب وہ سوچنے لگا کہ اُسے کونسی خاص جگہ جانا چاہیئے۔ لیکن اس استغراقِ ذہنی کی معیت میں اپنی ذلتِ خیال کا وہ احساس بھی تھا۔ جو اس سے بیشتر شرابخانے کے سامنے اسے ستا چکا تھا،

وہ ایک جگہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اور اسکی فطری نفاستِ طبع کھلم کھلا اس کریہہ صورتِ عمل کے خلاف بغاوت کرنے لگی۔ لیکن جب اُسے خیال آیا۔ کہ یہاں سے واپس جا کر اُسے وہی مسموم فضا نصیب ہو گی۔ جہاں سے وہ اسقدر نفرت کے جذبات اپنے دل میں لیکر نکلا تھا۔ تو اس نے اپنے عمل سے اپنی نفاستِ طبع کے برخلاف خود بھی مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اعلانِ جنگ کیلئے پھر گویا معائنہ ثانی کے لئے بازار کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ ابھی تین چار ہی قدم چلا ہو گا۔ کہ اس کے کان میں چند ایک تعریضی فقرے پڑے!

دو تین سیاہ مست ہوس کار جو اپنی اندھی جوانی اس کوچے کی خراب زار گلیوں میں کھو چکے تھے اور اب بطور مشغلۂ بیکاری اپنی پُر آرزو نگاہوں سے محض اس حُسن کو دیکھ دیکھ کر ہوسِ گناہ کو نامکمل طور سے سیراب کر رہے تھے۔ جس کو حاصل کرنا اب روپیہ کی کمی اور جسمانی قوت کے افلاس کی وجہ سے ان کے امکان سے باہر تھا۔ تھوڑے عرصے سے اس کے رویّے کو متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، قیافے کی وہ مشق جو کئی سال انہوں نے انہی گلیوں میں ٹھوکریں کھا کھا کر حاصل کی تھی۔ انہیں بتا رہی تھی کہ ظفر آج پہلی مرتبہ اس جگہ وارد ہوا ہے۔ ان میں سے ایک جو اپنے دورِ تعیش میں شراب کا عادی رہ چکا تھا۔ اور اب اس قیمتی سرور کی جگہ گانجے اور افیون کے مدہوش کن نشے

کی تباہیوں کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ ظفر کو ٹھٹکتا دیکھ کر اور پھر کچھ بے اختیاری کے سے انداز میں بڑھتا دیکھ کر نہ رہ سکا؛

اس نے اپنی آواز کو اراد تاً ضرورت سے زیادہ بلند کر کے طنزیہ لہجے میں کہا:۔

"میاں کہیں جاؤ گے یا یونہی پھرتے رہو گے"۔

دوسرا بولا:۔

"آجکل کے تماشبین اسی طرح کے ہوتے ہیں"۔

ظفر کو یوں محسوس ہوا۔ گویا کسی نے اُسے زمین پر سے اٹھا کر غلاظت اور کیچڑ میں دے مارا ہو۔ اُسے معلوم تھا۔ کہ اس طرح کے تعریضی کلمات بازار کی گالی کیطرح مڑ کر دیکھنے والے کو لگتے ہیں۔ اس لئے اس نے اسقدر ضبط تو کیا۔ کہ مڑ کر نہ دیکھا لیکن اب اس کے لئے آگے جانا محال ہو گیا۔ اسے اپنے پاؤں سو سو من کے معلوم ہوتے تھے بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر ایک مکان کی طرف مڑ جانے پر آمادہ کیا۔ اور پھر کسی بات کا امتیاز کئے بغیر وہ سیڑھیوں کو ایک خود فراموش اور جنوں خیز بیتابی سے طے کر گیا۔ آخری سیڑھی پہ پہنچکر وہ کھڑا ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر اس کے ذہن میں ضائع ہو جانے والی شرافت نے آخری دفعہ اپنا فرض ادا کیا۔ اور اس کی عقل نے اس کے دماغ نے اس زہر کے پیالے کو جسے وہ شربت سمجھ کر پی جانا چاہتا تھا۔ اس قدر قریب

دیکھ کر اسے اندر جانے سے روکا۔ لیکن اب وہ اس گناہ آلود فضا سے واپس نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس کے سامنے ایک انتہا درجے کی حسین عورت آسمانی رنگ کی ساڑھی باندھے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کر رہی تھی۔ اور اپنی تبسم آمیز نگاہوں سے اس دلربا پیغام کو ادا کر رہی تھی۔ جس کیلئے ظفر یہاں تک کھنچ کر آیا تھا۔ ظفر کو یوں محسوس ہوا۔ گویا کسی نے اُسے جیتے جی ایک جنتِ ارضی میں پہنچا دیا ہو۔ اور وہاں کی کوئی حور اس کے سامنے اپنی تمام رنگین جلوہ آرائیوں کے ساتھ باصرہ افروز ہو۔ وہ اس خوبصورت ناگن کی مقناطیسی جاذبیت سے لبریز آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اور گویا ان کی خطرناک کشش کے تاثرات سے مرعوب ہو کر آگے بڑھا۔ ہاں اسی طرح بڑھا۔ جس طرح کوئی جانور سانپ کی مسحور کن نگاہوں کے سامنے بیکس و بے بس ہو کر خود اپنے دشمن کیطرف کھنچا آتا ہے۔ بڑھا جاتا ہے۔

اس زہرہ پیکر لیکن تجربہ کار حور وش نے صورتِ حالات کو ایک ہی نظر میں بھانپ لیا۔ اور یہ سمجھ کر کہ اس جگہ وہ اجتناب جو دوسروں کی آتشِ شوق کو اور تیز کرتا ہے اور بھڑکاتا ہے۔ اس جگہ کام نہ آئے گا۔ خود ظفر کا ہاتھ پکڑ کر چاندنی پر بٹھا دیا۔ ساز بجنے آگئے۔ ساز درست ہونے لگے۔ فیروزہ (یہ وہ پیارا لفظ تھا۔ جس سے وہ خورشید جمال مخاطب کی جاتی تھی۔) نے ظفر کی طرف متجسسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا پوچھ رہی تھی

کہ آیا گانا شروع کیا جائے، ظفر اس اشارے کا مطلب سمجھ گیا۔ اور وہ جواب دینا چاہتا تھا، لیکن اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی زبان تالو سے چمٹی جاتی تھی، اتنے میں گلوریاں تیار ہو گئیں۔ چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی مشک بو گلوریاں۔

فیروزہ نے اپنی گردن کو ایک عجیب دلربایانہ خم دیکر گلوریاں پیش کیں۔ اور نہایت شیریں آواز میں کہا:۔

"شوق فرمائیے"۔

ظفر نے ایک گلوری اٹھالی۔ اور اسے محسوس ہوا۔ کہ اب کچھ نہ کچھ کہنا اس کا فرض ہو گیا۔ اس نے انتہائی کوشش کے بعد شرماتے ہوئے کہا:۔

"مہربانی"۔

پھر اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے بولا:۔

"کیا میں آپ کی خوش الحانی سے لطف اٹھانے کی درخواست کر سکتا ہوں"؟

فیروزہ نے مڑ کر سازندوں کی طرف دیکھا۔ اور طبلے پر تھاپ پڑی۔ اسی اثنا میں ظفر کو فیروزہ کی طرف دیکھنے کا موقعہ ملا۔ نہایت نازک اندام، سنہری بال موٹی موٹی بادامی آنکھیں:۔

ظفر ابھی اپنی نگاہِ شوق سے اس کے چہرے ہی کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہ فیروزہ نے

اپنے نازک ہاتھوں کی شمعی انگلیوں کو انگیوں میں ڈالکر ایک ادا سے انگڑائی لی۔ اور ریشمی دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور رقص شروع کر دیا۔ جب فیروزہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار تال کے ساتھ مل کر ختم ہوتی۔ اور مابعد ایک مدھم سا نقش چھوڑتی چلی جاتی تو ظفر کے دل کے تمام تار رقص کرنے لگ جاتے، خدا جانے وہ کتنا عرصہ اس متحرک فتنے اس بولتے ہوئے جادو کے تاثرات میں گم رہا۔ ہاں کچھ ہوش اسوقت آیا۔ جب اس نے آخری سم لیکر غزل شروع کی ؎

سب تمہیں آفتاب کہتے ہیں
اور کس کو شباب کہتے ہیں

جب اس مصرع پر پہنچی: "اور کس کو شباب کہتے ہیں"۔ تو سینہ ابھار کے، آنکھوں میں کیف کا ایک خاص انداز پیدا کر کے، ایسے استفہامیہ لہجے میں "اور کس کو" کہا اور شباب کے مظاہر کو اس ہوس انگیز طریقے سے ادا کیا کہ ظفر بیتاب ہو گیا۔ وہ ابھی اسی شعر کے کیف میں غرق تھا۔ کہ فیروزہ نے دوسرا شعر گایا ؎

مست آنکھیں وہ تو نے پائی ہیں
سب جنہیں نیم خواب کہتے ہیں

اور پھر ؎

ہم محبت کے باغ پیما ہیں آرزو کو شراب کہتے ہیں

جب اس شعر پر پہنچی۔ کہ ؎

اہل دل میرے داغ حسرت کو نقطۂ انتخاب کہتے ہیں

تو سراپا آرزو بن گئی۔ اور چہرے پر حرمانِ محبت کے مکمل آثار پیدا کر لئے۔ پھر اپنے دل کے قریب ہاتھ رکھ کر یہ مصرع پڑھا۔ ع

"نقطۂ انتخاب کہتے ہیں!"

ایک تو اشعار کی دلگدازی، پھر فیروزہ کی خوش الحانی، موسیقی کا اثر۔ وقت کی چیز شام کا سناٹا؛ یہ تمام عناصر مل ملا کر ظفر کو تباہ کر گئے۔ برباد کر گئے؛

(۳)

دو سال گزر گئے، سردیوں کی طویل راتیں آئیں۔ اور گزشتہ عشرت کے خاکستر میں دفن ہو گئیں۔ گرمی کے بارانی دن آئے۔ اور آخر ماضی کے سیاہ پردے میں چھپ گئے لیکن ظفر شام و سحر کی فتنہ کاری سے بے نیاز رہا۔ اور ایک دن بھی بھولکر اپنے گھر واپس نہ گیا۔ وہ دولت جو اس کے پسینے کی گاڑھی کمائی تھی اس قلیل عرصے میں اس اندھا دھند سرعت سے تباہ ہوئی۔ کہ ظفر کو ہوش اس وقت آیا۔ جب اس کی تہی دامانی روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو گئی۔ جھوٹی امیدوں نے اسے کامرانی کے لہلہاتے ہوئے سبز باغ

دکھلائے۔ اور اس نے قصداً اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کر کے اپنی آنکھیں فیروزہ کے نیچے تلے سرد مہر تغافل سے بند کر لیں؛

ایک شام فیروزہ جو اب پچھلے دنوں سے شام کو اکثر باہر نکل جایا کرتی۔ حسب معمول کہیں گئی ہوئی تھی۔ اور وہ بیٹھا انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ کہ یکلخت سیڑھیوں میں بھاری بھاری قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ وہ بیتابی سے اٹھا۔

فیروزہ ایک قوی ہیکل تنومند نوجوان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ رنگین آرزوؤں کا وہ بلوریں قصر جسے ظفر کے تخیل نے سر فلک بلندی تک پہنچایا تھا یکبارگی نیچے آرہا؛

نووارد ظفر کو دیکھ کر جھجکا۔ پھر فیروزہ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

"اچھا میں کل اسی وقت پھر آجاؤنگا"

فیروزہ نے اس کے بازو تھام لئے اور کہا:۔

"نہیں ٹھہریئے"

ظفر اپنی جگہ پر کھڑا مبہوت ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے توقع نہ تھی۔ کہ فیروزہ اس بیباک جسارت سے اس کے سامنے اس طرح کی باتیں کرے گی۔ کچھ عرصہ اس نے خیال کیا۔ کہ شاید وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن فیروزہ نے اُسے اس خوشگوار

فریب کے طلسم کو توڑ دینے پر مجبور کیا۔

اس نے ظفر کے قریب آکر نہایت آہستہ سے کہا:-

"ظفر اب تم جاؤ۔"

"جاؤں؟!"

ظفر نے یہ لفظ اس طرح ادا کئے۔ گویا وہ کچھ نہیں سمجھا۔ کہ فیروزہ کیا کہہ رہی ہے؛ وہ پھر بولی:-

"ظفر کیا تم سمجھتے نہیں۔ جبتک تم میرے اخراجات برداشت کر سکتے تھے میں تمہاری تھی۔"

اب ظفر کو غصہ آگیا۔ فیروزہ کو اس طرح پر سکون لہجے میں گفتگو کرتے دیکھ کر اس کی سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھیں۔ وفورِ جوش میں اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور نووارد جوان کی طرف دیکھا۔ جو طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا اب ظفر کو تاب نہ رہی، اس نے دانت بھینچکر کہا:-

"ہاں میں جاؤں گا۔ لیکن اس کو بھی ساتھ لیجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ نووارد کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ کہ فیروزہ نے اُسے اپنے پورے زور سے تھام لیا۔ اور منت سے بولی:-

ظفر۔ ظفر تم بھی عام آدمیوں کی طرح لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ تم تو کہتے تھے، مجھے تم سے بہت محبت ہے، دیکھو۔ ہوش کرو۔ تمہاری لڑائی سے مجھے نقصان پہنچے گا۔ اُسے نقصان پہنچے گا جس سے تم محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہو۔ جاؤ۔ چپ چاپ"

ظفر نے پوری قوت سے اپنے آپ کو فیروزہ کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور پھر نووارد کی طرف جھپٹا۔ وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ اور ظفر کے کان میں برابر فیروزہ کی آواز آتی رہی۔ جو منت آلود لہجے میں کہہ رہی تھی:۔

"ظفر۔ ظفر۔ خدا کیلئے۔ محسن تم ہی چھوڑ دو۔ دیکھو جانے دو۔ یا اللہ ۔۔ ۔۔۔"

نووارد نے جو ظفر سے بدرجہا مضبوط اور طاقتور تھا۔ آخر موقع پا کر اُسے دھکا دے دیا۔ اس کا پاؤں پھسلا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے خلا کو پکڑ کر سنبھلنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر یکلخت اس کا سر سیڑھیوں سے ٹکرایا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا اس کی گردن میں کوئی چیز ریزے ریزے ہو گئی ہو۔ سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا وہ نیچے آپڑا خلاف توقع اسکے حواس بجا رہے۔ نووارد بھی اسکے پیچھے پیچھے اتر آیا تھا۔ اس نے ظفر کے سر کو اٹھا کر اس کی گردن کو ٹٹولا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر حقیقی رنج سے لبریز آواز میں بولا:۔

"مجھے افسوس ہے۔"

ظفر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کراہ کر کہا:۔

"غلطی میری تھی مجھے ... ... مجھے اٹھا کر سڑک کے ... ... دوسری طرف رکھ آئیے۔"

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اسے یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کی گردن کو کسی نے تپتے ہوئے لوہے سے داغ دیا ہو۔

اس نے پھر کوشش کر کے کہا۔

"ورنہ ... ... ورنہ ...."

لیکن اب اس کے حواس جو ابتک قائم رہے تھے اسے جواب دے گئے تھے ایک عارضی بیہوشی نے اسے تکلیف اور درد کے احساس سے بچا لیا۔ نوار دنے اُسے آہستہ سے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اور سڑک کے دوسری طرف ڈال آیا۔

... ...

خدا جانے وہ کتنا عرصہ بیہوش رہا۔ جب اسے ہوش آیا۔ تو اس نے ایک خوبصورت اور غمگین چہرہ اپنے چہرے کے قریب جھکا ہوا دیکھا۔ اور اُسے خیال ہوا کہ شاید وہ مر کر جنت میں پہنچ گیا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ اور ہاتھوں کو اپنی گردن کے قریب جہاں اسے ابتک درد محسوس ہو رہا تھا لے جانا چاہا۔ لیکن دو

نازک ہاتھوں نے نہایت آہستہ سے اس کے بازوؤں کو تھام لیا۔ اس نے حیران ہو کر اپنی آنکھیں پھر کھولدیں اور ایک غمگین اور خوبصورت چہرے کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا، اس نے گھبرا کر اٹھنا چاہا، لیکن اس کے جسم کو پھر روک دیا گیا، اس نے اِدھر اُدھر پریشانی سے دیکھا۔ اور اس جگہ کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ کہاں تھا۔ شاید وہ اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ مگر نہیں۔ گھر سے تو وہ مدت ہوئی نکل کر آگیا تھا، پھر یہ کونسی جگہ تھی؟ کیا وہ فیروزہ کے مکان پر تھا، فیروزہ کا خیال آتے ہی اس کے تخئیل کے تمام تار مرتعش ہو گئے، اور اس کے حافظے نے دردناک صحت سے ان تمام واقعات کی یاد تازہ کی، جو اس آخری دن جب وہ فیروزہ کے مکان پر موجود تھا پیش آئے تھے اس نے اپنا منہ ایک طرف کو موڑ لیا۔ اور قریب کی ایک چھوٹی سی میز پر اُسے دوائی کی چند شیشیاں اور چند ایک اوزار نظر آئے۔ ابھی وہ ان کی موجودگی پر غور کر رہا تھا، کہ اسکے کان میں باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ اس نے اپنا منہ موڑا۔ اور اس ہستی کو جسے پہلے وہ حور سمجھا تھا۔ ایک اور شخص سے باتیں کرنے میں مصروف پایا۔ وہ شخص ظفر کو اپنی طرف دیکھتا پا کر قریب آگیا۔ اور ظفر کی نبض دیکھنے لگا۔ اب ظفر کو معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک ہسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھنے کے بعد نرس کی طرف دیکھ کر ایک عجیب انداز میں سر ہلایا۔ پھر وہ دونوں ملکر کچھ عجیب سی نگاہوں سے ظفر کی طرف دیکھنے لگے لیکن

اب ظفر کے حواس کافی طور پر مجتمع ہو چکے تھے۔ اور اسے تمام واقعات انگاروں کی طرح روشن اور نمایاں معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے کہا:

"ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر اس کے قریب آگیا۔ اور لبوں پر انگلی رکھ کر بولا:۔

"چپ چپ تمہارے لئے باتیں کرنا خطرناک ہے"۔

ظفر اس ہدایت کے علی الرغم بھی چپ نہ رہ سکا۔ اس کو اپنی آواز سینے میں رُکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، لیکن اس نے کوشش کر کے کہا:۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ کہ میں جلد ہی مر جاؤں گا۔ آپ مجھے یہ بتا دیجئے کہ مجھے اور کتنا عرصہ زندہ رہنا ہے۔ مجھے آج ... ..."

اس کی چھاتی میں ایک لہر سی اٹھی اور یکلخت اُسے خون کی ایک قے آئی۔

ڈاکٹر اب بالکل اس کے قریب آگیا۔

"آپ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ شاید دو دن اور زندہ رہیں"۔

ظفر نے اس خبر کو ایسے سکون سے سنا۔ گویا وہ موسم کے متعلق کوئی رسمی بات سُن رہا ہے اور اپنی موت کو اس قدر قریب پا کر اپنے دل کی گہرائیوں میں رنج کا ذرا سا شائبہ خوف کا کوئی معمولی عنصر بھی محسوس نہ کیا۔ اس نے نرس کی طرف بے معنی نگاہوں

سے دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں اسے رحم کی چمک محسوس ہوئی۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالکر منہ موڑ لیا۔ ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نرس اس کے قریب آکر سر کے نیچے تکیے درست کرنے لگی۔ درست کرتے کرتے بولی:۔

"پولیس آپ کے متعلق اشتہار بھی دے چکی ہے اور آپ کے گھر غالباً اب تک ہر قسم کی اطلاع پہنچ چکی ہوگی۔"

ظفر خاموش رہا۔ خون کی قے کرکے وہ بہت نڈھال ہوگیا تھا۔ اس سے بولا نہ جاتا تھا۔ لیکن فیروزہ کو آخری دفعہ دیکھنے کا خیال ستا رہا تھا۔ اس نے اشارے سے نرس کو اپنے قریب بلایا۔ اور رک رک کر بولا۔

"فیروزہ ... ... فیروزہ۔"

مکان کا پتہ وہ اچھی طرح ادا نہ کرسکا لیکن مشاق نرس جو اس سے پیشتر کئی بار اس قسم کے واقعات دیکھ دیکھ کر نامتمام فقروں کا مطلب سمجھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ سمجھ گئی اور بولی: "ابھی"

"نہیں ... ... کل"

(۴)

خدیجہ ظفر کی غیر موجودگی سے اسی قدر متاثر ہوئی۔ جسقدر ایک نیک اور وفا شعار

بیوی کا فرض تھا۔ لیکن صرف چند دنوں کیلئے۔ اس کے بعد اس کی زندگی کے تمام جذبات اپنے ماں باپ کی خدمت گزاری۔ جو اس کے پاس آرہے تھے، اور امتیاز کی غور و پرداخت میں مدغم ہو گئے۔ ظفر اپنی بیوی کے نام اپنی جائداد کا کچھ حصہ منتقل کر چکا تھا۔ اور اس کی مستقل آمدنی نے خدیجہ کو ہر طرح کے تفکرات سے بے نیاز کر دیا۔ جس شام ظفر فیروزہ کے مکان سے آخری دفعہ نکالا گیا۔ اس سے دو دن بعد شام کے وقت خدیجہ کے والد سید نوازش علی شاہ صاحب شمسی دفتر سے آکر حقہ نوشی کے پرسکون شغل میں مصروف تھے، ڈاڈھیر عمر کے آدمی تھے، اور شروع ہی سے ایسے پرانے خیالات لیکر پیدا ہوئے تھے کہ دورِ حاضرہ کے جلد بدلنے والے ہنگاموں نے بھی ان کی طبیعت پر کوئی اثر نہیں کیا۔ ریل کے دفتر میں ملازم تھے، اور سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے، صحتِ نسب، شرافت خاندانی اور اپنے نجیب الطرفین ہونے پر جا و بیجا تفاخر کا اظہار کیا کرتے تھے۔ جب لڑکیوں کی تعلیم کا اہم اور عظیم مسئلہ تمام ملک کے اہل الرائے کو دعوتِ عمل دے رہا تھا۔ تو انہوں نے اپنی خودسری اور اہلِ سادات کے فرائض کے متعلق غلط خیالات کے ماتحت سادات کے ایک خاص جلسے میں جو اسی غرض سے منعقد ہوا تھا۔ کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ بہت بیباکی اور جسارت سے پکار کر کہہ دیا، کہ کیا سید اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلوائینگے۔ کیا وہ انہیں سکول بھیجیں گے۔ کم از کم میں

اور یاد رہے مَیں شمسی خاندان کے تمام افراد کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ میری لڑکی انگریزی سکولوں میں جا کر کرسٹان بن جائے۔

جس شخص کے تعلیم کے متعلق یہ خیالات ہوں۔ اس سے یہ توقع رکھنا۔ کہ وہ اپنی لڑکی کو کسی قسم کی تعلیم دیگا۔ یا اس کے ذہنی نشوونما میں کسی طرح ممد و معاون ثابت ہوگا۔ فضول تھا۔ اسی لئے ان کے خاندان کے باقی افراد کو اس بات پر بہت تعجب ہُوا۔ کہ وہ خود اپنی لڑکی کو ظفر سے جو ہر چند کہ ایک متمول و معزز آدمی تھا۔ اور سب جج کے عہدے پر فائز تھا۔ لیکن پھر بھی غیر گھرانے کا لڑکا تھا۔ کسی طرح بیاہ دینے پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ تھی۔ کہ ان کو خود بھی بار بار اس رشتے پر افسوس آتا تھا۔ اور خاصکر جب ظفر گھر سے نکل کر چلا گیا۔ تو ان کے بجا افسوس کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اکثر بیٹھے سوچا کرتے۔ کہ اپنے گھرانے سے باہر رشتے کرنے کا انجام یہی ہوتا ہے۔ مجھے یقیناً اپنی لڑکی شمسیوں ہی کو دینی چاہیئے تھی۔ آج بھی وہ اسی قسم کے خیالات میں مستغرق تھے۔ اور حُقّے کی نَے کو اپنے لبوں سے لگائے دھوئیں کی طرف غور کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اِن کے قریب ہی ایک طرف ان کی بیوی انوری بیگم بیٹھی اپنے نواسے امتیاز کی قمیص سی رہی تھی۔ خدیجہ بھی ایک طرف کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔

شمسی صاحب نے دیکھا کہ تمباکو جل گیا۔ بیوی سے بولے "خدیجہ کی ماں ذرا چلم تو بھروا دینا"۔

انوری بیگم تیوری پر بل ڈال کر اُٹھیں۔ وہ شمسی صاحب سے بھی زیادہ بد مزاج اور پرانے خیالات کی تھیں۔ اور شمسی صاحب کی حقہ نوشی کو ایک تکلیف لازم سمجھ کر خاموش ہو رہتی تھیں۔ ورنہ انہیں اس مشغلے میں بہت سی برائیاں نظر آتی تھیں۔ چلم اُٹھانے کو تو اُٹھا لی۔ لیکن ذرا تلخ سے لہجے میں کہنے لگیں۔ "کیا ہر وقت حُقہ لئے بیٹھے رہتے ہو"۔

شمسی صاحب خاموش ہو گئے۔ اس وقت انہیں لڑائی کرنا پسند نہ تھا جہاں حقہ پینے والے قطب جنبد نہ جنبد گل محمد کے مصداق بن جاتے ہیں۔ وہاں ان کے دل سے جوش اور غصے کے مادے کا اکثر و بیش تر حصہ مفقود ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی بیوی کی طرف شکوہ آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر فلسفیانہ متانت سے قریب کی میز سے سیاست کا پرچہ اُٹھا لیا۔ اور چشمہ کو اپنی ناک پر درست کرتے ہوئے ورق گردانی کرنے لگے۔ یکبارگی ان کی نگاہ ایک عنوان پر جم کر رہ گئی۔ انہوں نے دھڑکتے ہوئے دل سے عنوان کے نیچے کی سطور کو پڑھنا شروع کیا۔

"لاہور مورخہ ۳۔ دسمبر۔ سرکاری ہسپتال میں ایک مریض پہنچایا گیا ہے جس کا نام [illegible] برس کی عمر ہے۔ گردن کا

ہڈی کو ضرب شدید پہنچی ہے۔ حالت مخدوش ہے۔ رشتہ داروں کو سرکاری مسپتال سے مفصل اطلاعات مل سکتی ہیں۔"

اشتہار پولیس کی طرف سے تھا۔ شمسی صاحب کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انہوں نے دوبارہ سطور کو پڑھا۔ کہ کہیں ان کی آنکھوں نے انہیں کسی قسم کا دھوکا تو نہیں دیا۔ لیکن مطلب بالکل صاف اور واضح تھا۔ اتنے میں خدیجہ کی والدہ بھی آگئی۔ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولے۔ "لو لڑکی کی تقدیر پھوٹ گئی۔"

خدیجہ کی والدہ ہر چند کہ شقی القلب تھیں۔ لیکن آخر عورت تھیں۔ گھبرا گئیں۔ چلم ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ ہکلا کے کہنے لگیں "کیا..... کیا ہے؟"

خدیجہ نے اپنا سر زخمی ہرن کی طرح اٹھایا۔ اور ملتجی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ شمسی صاحب نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر بولے۔ "بیٹی۔ تیرا خاوند ہسپتال میں زخمی پڑا ہے۔ لکھا ہے کہ حالت خطرناک ہے۔"

خدیجہ نے ایک چیخ ماری۔ اور اٹھ کر فوراً والد کے قریب آگئی۔

اس کی والدہ نے خدیجہ کو سنبھال لیا۔ اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پھر خاوند کی طرف قہر پاش نگاہوں سے دیکھ کر بولیں "تم نے تو بچی کی جان

نکال لی تھی۔ اچھی طرح مضمون تو پڑھا ہوتا۔ کیا لکھا ہے کیا حالت بہت خطرناک ہے۔"

شمسی صاحب اس بیجا اظہار ناراضگی پر بھی خاموش رہے۔ آہستہ سے بولے۔ "لکھا تو یہی ہے۔ کہ گردن کی ہڈی کو ضرب پہنچی ہے۔"

خدیجہ، کی جو اب تک بُت بنی کھڑی تھی، جان میں جان آئی۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔" ابا۔ جایئے اور اُنہیں یہاں اُٹھا کر لے آیئے۔"

پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولی۔" مَیں بھی ساتھ چلتی ہوں۔"

شمسی صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے۔ لیکن اب کہ واقعہ کا فوری صدمہ اپنی شدت میں بہت کچھ کم ہو چکا تھا۔ خدیجہ کی والدہ کچھ اور سوچ رہی تھیں۔ اُنہوں نے سر بلند کر کے خاوند کی طرف دیکھ کر کہا۔" خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ آخر میری بچی کا صبر پڑا۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ کل چلے جانا۔ ذرا اسے بھی تو تکلیف برداشت کر لینے دو۔ پتہ لگے۔ گھر سے باہر رہ کر کیا کیا اذیتیں ہوتی ہیں۔ حالت اتنی خطرناک تو ہے نہیں۔"

آخری فقرہ گویا انوری بیگم نے عذر کے طور پر پیش کیا شمسی صاحب اتنے شقی القلب نہ تھے۔ لیکن بیوی کے جا و بیجا احکام ماننے کے اس قدر خوگر ہو چکے تھے۔ کہ اختلاف رائے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے بیٹی کی طرف استفہامیہ

انداز سے دیکھا۔ خدیجہ چپ رہی۔

انوری بیگم خدیجہ کے قریب آکر پیار سے کہنے لگیں "بیٹی کل چلی جانا۔ آج ذرا اُسے ہسپتال میں رہنے دو۔"

خدیجہ پھر خاموش رہی۔ اور اپنے نام نہاد فرض کا وہ احساس جو اُس نے والدین سے ورثے میں پایا تھا۔ اور جواب اس کی فطرت میں ایک نسوانی خصوصیت کی طرح جاگزین ہو گیا تھا۔ اسے مجبور کرنے لگا۔ کہ وہ اپنی ماں کی فرمانبرداری کرے.....

۵

ظفر کو مکمل ایک دن اور ایک رات کے بعد ہوش آیا۔ اس کو اپنے اردگرد مہیب اور سُنسان تاریکی مسلط ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اور اس کا دل ڈوبنے لگا اسے یوں محسوس ہوتا گویا کبھی کبھی فضا کی تاریکیوں میں مختلف النوع روشنیاں چمک جاتی ہیں۔ کبھی اسے تمام کمرہ گہرے سرخ رنگ میں ملبوس دکھائی دیتا۔ کبھی شہابی رنگ میں، کبھی سبز رنگ میں اور پھر کبھی یہ تمام روشنیاں ایک دوسرے میں ملکر ایک عجیب رنگ پیدا کر لیتیں۔ ظفر اس بات کو محسوس کر کے حیران ہُوا کہ اس کو اپنی گردن میں کوئی درد محسوس نہ ہوتا تھا۔ برخلاف اِس کے وہ اپنا جسم پہلے سے زیادہ سبک پاتا تھا۔ کمرے کی تمام اشیا اسے دھندلی سی نظر آتی تھیں۔ ہر چند کہ وہ

محسوس کر رہا تھا۔ کہ کمرے میں بجلی کا لمپ روشن ہے۔ لیکن ایک محدود دائرۂ نور کے علاوہ اسے کوئی چیز نور سے منعکس نظر نہ آتی تھی۔ اس نے دائیں طرف کروٹ بدلی، اور اس وقت اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہے۔

اس نے اپنے آپ کو بستر پر سے ذرا اُٹھا کے آنکھیں پھاڑ کے اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کی۔ عین اس وقت اس شخص نے اپنا سر اُٹھایا۔ اور ظفر نے فیروزہ کو خوب اچھی طرح پہچانا۔ اسے فیروزہ کا چہرہ اس وقت دوسری چیزوں کے تقابل میں بہت زیادہ روشن، بہت زیادہ نورانی، بہت زیادہ حسین معلوم ہوتا تھا۔

وہ انبساط و مسرت کی رنگین پہنائیوں میں غرق ہو گیا۔ اور بولا "فیروزہ فیروزہ"

اسے اپنی آواز خلافِ معمول بہت صاف معلوم ہوئی۔ وہ تکلیف جو اُسے بولنے میں محسوس ہوتی تھی۔ آج بالکل ناپید تھی۔

فیروزہ نے جواب دینے کے بغیر اپنے گال ظفر کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ اور اپنے گرم گرم آنسوؤں سے انہیں دھونے لگی۔

ظفر نے کہا "فیروزہ مجھے گانا سناؤ"

وہ گانے لگی۔ اور شاید اس نے اپنی روح کے تمام سوز کو راگ کے الفاظ میں قید کر دیا۔ کیونکہ ظفر کو یوں محسوس ہُوا۔ گویا وہ اپنے جسم کو چھوڑ کر راگ کے زیر و بم کے ساتھ پرواز کر رہا ہے۔ اسے الفاظ بالکل نہ سُنائی دیتے تھے۔ لیکن وہ لے کے گداز کو نمایاں طور پر محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد اسے خیال ہُوا کہ شاید وہ اس دُنیا کو چھوڑ کر کسی اور پر سکون دنیا میں جا بسا ہے۔ جہاں ہر طرف نغموں کی نشاط آفرینی سے ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔

جہاں غنچے مسکرا رہے ہیں۔ جہاں پھول کھل رہے ہیں۔ جہاں عطر بیز ہوا خوشبو کے مستی افزا خزانے اپنے کاندھوں پر رکھے رواں ہے۔ پھر اسے یکبارگی ایک جھٹکا سا محسوس ہُوا .....

فیروزہ نے ظفر کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔ اور پائینتی پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ آج وہ پہلی دفعہ خلوصِ دل سے روئی۔

نرس نے ظفر کے چہرے پر کپڑا ڈال دیا۔ اور واپس مُڑی۔ دروازے میں اسے ایک برقعہ پوش عورت اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا دکھائی دیا اسے ہدایات مل چکی تھیں کہ صرف مریض کے رشتہ داروں کو آنے کی اجازت دی جائے۔ اس نے مرد کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"مریض میرا داماد ہے۔ یہ اس کی بیوی ہے۔"

نرس نے مڑ کر جھکی ہوئی فیروزہ روتی ہوئی فیروزہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی بیوی کی طرف دیکھا۔ جو خاوند کے مرنے کے بعد آئی تھی۔ اور اُس نے تحقیر کے ایسے لہجے میں نفرت کے ایسے انداز میں طنز کے ایسے طریق میں جو صرف ایک عورت سے مخصوص ہے۔ کہا۔ "افسوس آپ صرف چند لمحے دیر میں آئے ہیں" اور کمرے سے باہر نکل گئی ✣

بہار

'کاٹنی ہے بھرپور جوانی'

حالی :- فرید یاد بیوہ

بہار

درخت پھر لہلہانے لگے ،

پھر ہواؤں میں ایک نرم و نازک سی خوشبو پیدا ہوگئی ، مرجھائی ہوئی پتیوں میں سے ہنستے ہوئے ، مہکتے ہوئے پھول پھوٹنے لگے ، پرندوں کی نرم نرم بولیاں دل میں نا معلوم جذبات اور خوابیدہ احساسات کو بیدار کرنے لگیں ،

وہ پہلے ہی سے صبح و شام تھے ! لیکن ان سے زیادہ رنگین و دلکش ، دن زیادہ تابناک راتیں زیادہ پر اسرار تھیں ،

آج صبح ہی سے سلطانہ کے دل میں ایک بے چینی ، ایک خلش سی تھی ، جس کی وجہ اسے معلوم نہ ہوتی تھی ، یوں تو اُسے بیوہ ہوئے کوئی بہت دن نہیں بیتے تھے ، لیکن اُسے کچھ سکون حاصل ہو گیا تھا ، جب جوانی ۱۷ ، ۱۸ سال کی ایک لڑکی کے صحت مند پیکر میں فوّارے کی طرح رقصاں ہو تو بیوگی کا حادثہ بھی کچھ عرصے کے بعد سوز و دروں کی شدت

قائم نہیں رکھ سکتا، حیات و نشاط کی وہ تیز رو جو جوان مرد اور عورت کے سرخ خون کے ساتھ گردش کرتی ہے۔ بہت جلد غم کے تاریک لمحوں سے نجات حاصل کر لیتی ہے۔

آج سلطانہ مایوس سے سکون کے مقابلے میں دل میں ایک بے نام سا اضطراب محسوس کرتی تھی۔ جیسے کوئی کسی پابندی پر جھنجھلا رہا ہو۔ اس کی ساس صبح سے کسی قریبی رشتہ دار کی موت کے سلسلے میں شام تک کے لئے باہر گئی تھی، اور اکیلی ہونے کی وجہ سے اسکا جی اور زیادہ گھبرا رہا تھا۔ صبح سے لے کر اس وقت تک کہ دس بج چکے تھے، وہ کئی بار آنگن میں چکر کاٹ چکی تھی، کئی بار کتاب اُٹھا کر ایک دو صفحے پڑھ کر چھوڑ چکی تھی۔ پردہ اٹھا کر گلی میں جھانک چکی تھی، ——— لیکن قرار تھا کہ کسی پہلو نہیں آتا تھا اور خلش تھی کہ بڑھتی چلی جاتی تھی ——— باہر نکلی، اندر آئی، رُک گئی، سامنے پلنگ پر ذرا دیر کیلئے بیٹھی، پہلو بدلا، اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ سامنے ایک آئینہ تھا۔ کچھ بیخودانہ سے انداز میں گویا خود اُسے معلوم نہیں کہ دیکھ رہی ہے۔ آئینے کی طرف دیکھنے لگی دیر تک اس کی آنکھوں کے سامنے نیم شعوری طور پر صرف شیشے کی صاف چمکتی ہوئی سطح رہی۔ جس میں اسے اپنا عکس دکھائی ہی نہ دیتا تھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح دیکھتی رہی۔

پھر تھوڑی دیر میں آئینے کی سطح کی تابانی کم ہوتی معلوم ہوئی، پتلیوں نے کام کرنا شروع کیا

اور سلطانہ کو اپنا عکس نظر آیا،

بھرا بھرا متناسب جسم، سانولا رنگ، جس میں صحت کی خوبی سے رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کے قریب تیز تیز سرخی جھلکتی تھی، کالے گھنے بال۔ سیدھی مانگ، ناک پتلی، اور ذرا معمول سے چھوٹی، دائیں رخسار پر کنپٹی کے پاس ایک تل، ہونٹ معمولی، لیکن کناروں پر ذرا نیچے کی طرف جھکنے کا پہلو لئے ہوئے، آنکھیں معمولی سیاہ۔ پلکیں معمولی سے زیادہ گھنی اور دراز، کہ اُن سے آنکھوں پر ایک سایہ سا پڑتا نظر آتا تھا، بھویں ہلکی اور کشیدہ،

پلنگ پہ بیٹھے بیٹھے اس نے غور سے اپنی صورت کی طرف دیکھا، ایک دو بار رخساروں کو آہستہ آہستہ چھوا، جلد کی نرم و نفیس ساخت، اسکی اپنی انگلیوں کو چھونے میں لذت بخش معلوم ہوئی، دو تین بار جلدی جلدی آنکھیں جھپکیں، ذرا مسکرائی اور پھر اپنی کمر لچکا کے، ذرا جسم کو ایک طرف خم دے کر جھک کر، اپنے چہرے کی طرف غور سے دیکھا، کہ اس طرح کیسا معلوم ہوتا ہے، اس طرح کرنے سے اس کی کمر کے کھینچاؤ سے جو خم پسلیوں اور شانوں کے درمیان پیدا ہوا۔ اس سے اس کے اُبھرے ہوئے سینے کا اُبھار اور بھی نمایاں نظر آنے لگا۔

کچھ دیر تک سر کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی، پھر اس طرح

پلنگ پر لیٹ گئی، دونوں باتھوں کو سر سے اوپر کر کے تکیے کے دونوں کنارے بھینچ کے تھام لئے، ۔ اور اس طرح کچھ دیر لیٹی رہی،

تین سال ہو چکے تھے!

اس جسم کو جو ہر ان لذتِ حیات کے ایک نئے پہلو کا انکشاف کرتا تھا۔ اور جس سے ہر لمحہ امنگ اور اٹل آرزوں کے سیلاب کا اظہار ہوتا تھا، اپنے جائز اور ابدی حق، اپنے خاوند کی آغوش سے جدا ہوئے تین سال ہو چکے تھے! ——— وہ ایک نوجوان بیوہ تھی!

تین سال میں ہندوستان میں چھ بار بہار آتی ہے۔ چھ بار فطرت نکھر کر اور بن سنور کر پچھلے عہد و قیود کو توڑ کر حسن و ذوق نمو سے تجدید پیماں کرتی ہے، ——— لیکن اس تشنۂ حیات جسم کے ساتھ، ایک گھونٹ پانی ——— ایک بوند کے لئے بخل ہے!

پلنگ پر اس طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔ کہ باہر سے آواز آئی "بلوری چوڑیاں لے لو" دو تین بار یہ آواز آئی۔ لیکن ہر بار اس کے انجانِ[1] نفس کی گہرائیوں میں گم ہو کر رہ

---

[1] انجانِ نفس UNCONSCIOUS MIND کا ترجمہ حضرت وزیر حسن دہلوی کا مجھے بہت پسند آیا ہے۔

گئی۔ پھر یکایک آواز قریب سے آئی، اس آواز میں ایک لرزش حیات تھی! جیسے پنجاب کے ایک صحت مند نوجوان کی آواز ہو! اس کے کانوں کے پردوں سے آواز چوتھی بار ٹکرائی تو گویا اس کے نظام عصبی کے تمام تار جھنجھنا اُٹھے۔ آہستہ سے پلنگ سے اُٹھ کر بھاری بھاری قدم رکھتی ہوئی، آنگن سے نکل کر دروازے تک پہنچی، دروازے چک پڑی تھی چک میں سے دیکھا کہ ایک چوڑی والا لڑکا آواز لگا رہا ہے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا، گلی میں بس یا ان کا مکان تھا، یا سامنے میر محمد حسین کا، آج اس میں تالا پڑا تھا، کوئی راہ گیر بھی نظر نہ آیا، اس نے چک کے پاس کھڑے ہو کر آہستہ سے پکارا، "او چوڑی والے"۔

چوڑی والے لڑکے نے آواز سن کر اس طرف منہ پھیرا اور مسکراتا ہوا چک کے پاس آیا، اس کی عمر کوئی سترہ اٹھارہ سال کے قریب ہوگی۔ مسیں بھیگتی ہوئیں۔ دُبلا پتلا، بدن غیر ضروری گوشت سے بالکل خالی! گورا رنگ، آنکھیں موٹی موٹی، سیاہ اور روشن، ہنستا ہوا چہرہ! دانت دودھ کی طرح سفید اور باریک، اس وقت بھی چہرہ پر تبسم تھا۔

سلطانہ نے چک کے پیچھے سے کہا "بلوری چوڑیاں دکھاؤ"۔

چوڑی والے نے مسکرا کر پوچھا "بیوی جی! گجرا دکھاؤں کہ باریک بلوری چوڑی"

یہ کہکر اس نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے چمک کی طرف دیکھا، باہر روشنی تھی! اندر نسبتاً تاریکی، اس لئے چوڑی والے کو اندر کی چیز صاف نظر نہ آسکی ہوگی۔ اور سلطانہ چمک سے ذرا پرے بھی تھی، یہ سوال سُنکر وہ ذرا آگے کھسک آئی اور ہلکی آواز میں کہا "دونوں"

چوڑی والے نے اب ذرا پھر نظر اُٹھا کے چمک کی طرف دیکھا، اور پھر سر جھکا کر چوڑیاں نکالنے میں مصروف ہوگیا، سلطانہ اب چمک کے ساتھ لگی کھڑی تھی، چوڑی والے نے چوڑیوں کے گچھے نکال کر ہاتھ بڑھایا، سلطانہ نے ہاتھ نکال کر دونوں گچھے لے لئے، چوڑی والے کو ان سانولے ہاتھوں کی نفاست دیکھنے کا موقع ملا، اَب اُسے سلطانہ کے خط و خال بھی نظر آتے تھے، اگرچہ بہت صاف نہیں، ایک لمحے کیلئے سلطانہ نے بھی نظر بھر کے اس نوجوانِ خوب رو کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے گردن جھکا کر چوڑیاں دیکھنی شروع کیں، کچھ دیر، ہاتھ کے ساتھ چوڑیاں رکھ رکھ کر دیکھتی رہی، پھر اس طرح ہاتھ نکال کر واپس کر دیں، جب چوڑی والے نے چوڑیاں لیں تو خدا جانے کس طرح، سلطانہ کی انگلیاں اسکی انگلیوں سے چھو گئیں یکبارگی اُسے یوں محسوس ہوا، گویا کسی نے وہاں جلتا ہوا کوئلہ رکھ دیا ہے۔ اس ہلکے سے مس، اس لمس خفی، اس اتفاقی چھو جانے سے، اس کے تمام بدن میں کپکپی سی پیدا ہوگئی، اور

اس کی انگلیاں کانپنے لگیں، چوڑی والے نے انگلیوں کے چھوئے جانے کے ساتھ ہی، اپنے ہونٹ دانتوں سے چبا لئے۔ اور جلدی سے نظر اُٹھا کر چک کی طرف دیکھا۔ لیکن سلطانہ گھبرا کر پرے ہٹ گئی تھی، چوڑی والے کو اب اس کے جسم کا کوئی حصّہ نظر نہ آتا تھا۔

ساتھ ہی سلطانہ نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔ "کیا نازک جانی چوڑیاں ہیں"

وہ خود اپنی آواز کے بلند ہونے پر متعجب تھی۔ اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اس نے اپنی معمولی آواز میں کیوں بات نہ کی تھی، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، وہ پیچھے ہٹتی تھی، لیکن ایک کشش اُسے آگے کی طرف کھینچتی تھی، وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی، جو خشک ہوئے جاتے تھے، چوڑی والے نے افسردہ سی آواز میں دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہیں! بیوی جی" اور یہ کہہ کر چوڑیاں نکالنے لگا۔ اس بار سلطانہ کو اس کی آواز میں ایک لچک، ایک ترنم سا معلوم ہوا، جس میں اُداسی بھی شامل تھی۔ جب اُس نے سر جھکا کر چوڑیاں نکالنی شروع کیں، تو سلطانہ پھر چک کے قریب آ گئی اور غور سے چوڑی والے کی خم شدہ گردن کی گولائی کی طرف دیکھتی رہی۔ اِس خوبرو نوجوان کے ہاتھ بڑے سبک اور انگلیاں بہت نازک تھیں، سلطانہ نے اپنے بھرے بھرے ہاتھوں کی طرف دیکھا، اور اُس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھوں کے

ساتھ ہاتھ چھوئے جانے کا خیال کر کے اس کے ہاتھ پھر کانپنے لگے۔ چوڑی والے نے چوڑیاں نکال کر پھر بڑھائیں، ایک لمحے کے لئے سلطانہ ٹھٹھکی، پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر چوڑیاں لے لیں، چوڑیاں لیتے وقت سلطانہ کی انگلیاں پھر اس کی انگلیوں سے چھو گئیں، اور اس بار چوڑی والے نے آہستہ سے چوڑیاں دیتے وقت سلطانہ کا ہاتھ دبایا، ضرورت سے ایک لمحہ زیادہ تک کے لئے سلطانہ نے اپنا ہاتھ اُس طرح رہنے دیا اور پھر چوڑی والے کی انگلیوں کا دباؤ اُسے زیادہ ہوتا محسوس ہوا، اُسے یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی کوئیں میں گرتی چلی جا رہی ہے، ان نازک نازک انگلیوں کے دباؤ سے اس کے اپنے ہاتھوں میں سے گویا جان سی نکلی جا رہی تھی، یکبارگی اس کو اپنے جسم میں استرخا کا احساس ہُوا، اور قریب تھا کہ چوڑیاں اس کے ہاتھ سے گر پڑیں کہ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اندر کھینچ لیا، چوڑی والے نے پھر غور سے چک کی طرف دیکھا، اب سلطانہ بھی دروازے کے ساتھ لگی، چوڑیاں ہاتھ میں لئے چپ چاپ کھڑی اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوئی تو اس پر روشنی کی ایک شعاع پڑی جس کی تابانی میں دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، سلطانہ نے ایک ہنستا ہوا چہرہ دیکھا اور چوڑی والے نے ایک تمتماتی ہوئی سانولی شکل دیکھی۔ دونوں اس طرح دس پندرہ سکنڈ، ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے، آخر سلطانہ نے

آنکھیں جھکالیں اور چوڑیاں لے کر ہٹ کھڑی ہوئی۔ لیکن اب اس سے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا اسے ڈر تھا کہ چوڑیاں ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جائیں گی۔

چوڑی والے نے اپنا ایک رخسار چک کے ساتھ لگا لیا تھا۔ اور ایک طرف منہ کئے بیٹھا تھا

کچھ دیر کے لئے سلطانہ اسی طرح لرزاں و ہراساں کھڑی رہی، کہ ہوش نہ تھا میں کہاں ہوں،

کچھ عرصے کیلئے سماج کی تمام پابندیاں جنہوں نے اس کے جسم کو گھلا گھلا کر برباد کر دینا چاہا تھا۔ پھنکارتے ہوئے اژدہاؤں کی طرح اس کے سامنے آن کر کھڑی ہو گئیں، بدنامی، رسوائی، ذلت طعن و تشنیع، سماج کے تمام ہتیار، اور سماج کی تمام سزائیں لیکن یہ خیالات صرف ایک لمحے کے لئے تھے، اس کے بعد وہ آرزوئیں، جو چپ چاپ، پیدا ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ چنگاریوں سے شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ابدی اور غیر فانی! مرد عورت کے لئے یکساں! جن کے چنگل میں انسان کی فطرت اسیر ہے! سلطانہ کے دل میں سلگنے لگیں، جوانی کے وہ لذت آشنا خیال جنکے بغیر، کائنات کے تمام مزے پھیکے ہیں۔ جن کے بغیر زندگی ایک خواب بے ہوشی ہے سلطانہ کے دل میں کروٹیں لینے لگے،

تین سال کے درد و اضطراب کی سوئی ہوئی تلخی آج ناقابل برداشت ہو گئی!

سلطانہ کو چوڑی والے کا صرف ایک رخسار نظر آ رہا تھا، اُسے یوں معلوم ہوا گویا اس سرخ و سفید رخسار میں سے گرمی کی ایک رَو نکل کر اس کے بدن میں سماتی جا رہی ہے، وہ چوڑیاں لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھی، چک کے پاس پہنچ کر جہاں چوڑی والے کا رخسار تھا اس نے وہاں ہاتھ رکھ دیا۔ چک کے پردے کے باوجود اسے گال کی گرمی اور ماتھے کے پاس کی نسوں کی پھڑک محسوس ہوئی۔

چوڑی والے نے آہستہ سے گردن موڑ کر اندر کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں، سلطانہ نے ہاتھ نکال کر اس کے دائیں ہاتھ کو چھوا چونک کر چوڑی والے نے اپنی گال اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ سلطانہ نے آہستہ آہستہ اسکا سر اوپر اُٹھایا، اور چک ہٹا کر دیکھا، دونوں کی آنکھیں پہلی بار کسی حجاب کے بغیر چار ہوئیں۔

ایک طرف محبّت کی لذتوں سے آشنا ایک نوجوان لڑکی تھی۔ جس کے روئیں روئیں سے زندگی پھوٹی پڑتی تھی۔ اور جسے سماج نے زندہ درگور کرنا چاہا تھا، دوسری طرف ایک ناتجربہ کار نوجوان لڑکا تھا۔ وہ عورت کی دلکشی کے راز سے باخبر تھا، لیکن لذت ہائے محبت سے ناآشنا تھا، ایک قوت کشاں کشاں

اُسے محبت کے حلقۂ پراسرار میں کھینچے لئے آرہی تھی،

سلطانہ نے آہستہ سے کہا "اندر آجاؤ"

چوڑی والے نے ابھی تک سلطانہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا، ایک لمحے کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پھر دیکھا پھر مرد کے ہاتھ کی گرفت عورت کے ہاتھ پر قوی ہوگئی، اور وہ چک اُٹھا کر اندر داخل ہوا !

موتی کرن کپور گلزار تخت بلند بیگم

خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است

"خیام"

موتی کرن کپور گلزار تخت بلند بیگم

ہم چاروں مختلف موضوعات پر بحث کر کے تھک چکے تھے۔ اور اب گاڑی کے کمرے میں وہ خاموشی مسلط تھی جو ایک طویل گفتگو کا تتمہ ہوتی ہے۔

نسیم کھڑکی کے پاس بیٹھا اپنے ناخن پالش کر رہا تھا، ناخن پالش کرنے کا اسے خبط ہے، باتیں کرتا جاتا ہے ناخن پالش کرتا جاتا ہے۔ ہماری بدقسمتی سے ڈاکٹر ہے، اس لئے ہمیں بھی یہ مشورہ دیتا ہے۔ اکثر کہا کرتا ہے، محرقہ بخار کیوں ہوتا ہے، ناخن نہ پالش کرنے سے! ہیضہ کیوں ہوتا ہے، ناخن پالش نہ کرنے سے، یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی ایک قاتلانہ عزم کے ساتھ اٹھتا ہے، اور نسیم کی مرمت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد کچھ مدت کے لئے ناخن کے موضوع سے نجات ملتی ہے۔

درمیانی نشست پر حافظ صاحب تشریف فرما تھے۔ ابھی کئی سیر حلوا اور پوریاں انکے سامنے رکھا تھا، بحث کے دوران میں کھاتے جاتے تھے اور تازہ دم ہو کر بولتے جاتے تھے۔

میرے ساتھ کی نشست پر ناظم صاحب بیٹھے تھے، ایک مقامی کالج میں نباتات کے پروفیسر تھے، اور بحث کے دوران میں جب کوئی "ذرا ذرا گرم ہو" جاتا تھا۔ تو طنزیہ انداز میں ایک ایسا جملہ چست کرتے تھے کہ بحث پھر معمولی روش کی ہو جاتی تھی۔

اس مختصر سی تمہید کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم میں سے کوئی اس مزاج اور ذہنیت کا نہ تھا۔ کہ کسی افسانہ طرازی سے جلدی مرعوب یا متاثر ہو جاتا لیکن ــــ خیر، آپ خود فیصلہ کیجئے۔

بھوپال سے تین چار سٹیشن ادھر گاڑی ٹھہری تو کمرے میں صرف ہم چار ہی تھے۔ اس خوش پوش نوجوان کو پہلے نسیم نے دیکھا، اور مڑ کے کہا "دیکھنا یار کتنا خوش شکل نوجوان ہے اسی طرف آرہا ہے، چلو

سرودِ خانۂ ہمسایہ حسنِ راہ گذرے

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، واقعی ایک خوش پوش نوجوان، چشمہ لگائے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ گورا رنگ، قد چھوٹا، ماتھے پر خوش طبعی کی پیدا کردہ شکنیں نقش اتنے تیکھے کہ شبہ ہو کہ لڑکی نے بھیس بدلا ہے۔

ہمارے کمرے کے پاس آکر ٹھٹھک گیا۔ اور استفہامیہ سے انداز میں دیکھنے

لگا۔ میں نے کہا" آیئے جگہ کافی ہے"

"شکریہ"

اور نوجوان کمرے کے اندر تھا۔

حافظ صاحب اُٹھے، گھور کر نووارد کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔

"کہاں جایئے گا"

"بھوپال"

ناظم صاحب نے اپنے ساتھ جگہ خالی کرتے ہوئے کہا "آیئے بیٹھئے"

"شکریہ" اور اس مختصر سی گفتگو کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ مغرب سے جہاں ہم نے اور بہت سی باتیں خواہ نخواہ مستعار لی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ ریل کے مسافر بغیر باقاعدہ رسمی تعارف کے سیکنڈ کلاس کے کمروں میں بات نہیں کر سکتے۔

تھرڈ اور انٹر کلاس میں یہ تکلف اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہاں ہر ایک مسافر کو حق حاصل ہے۔ کہ دوسرے کی بات میں دخل دے، جب جی چاہے بات کرے جب جی چاہے کھائے۔ جہاں جی چاہے تھوکے، جہاں جی چاہے سگرٹ پی کر پھینک

دے، یعنی اچھی گھما گھمی رہتی ہے۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد میں نے نسیم سے کان میں کہا، "یار یہ آدمی خوش ذوق معلوم ہوتا ہے، بات شروع کرد کوئی"

نسیم صاحب نے اشاروں ہی اشاروں میں جواب دیا اور کچھ منٹ کے بعد کہنے لگا۔ "الف لیلہ کا ایک نیا ایڈیشن پیرس سے نکلا ہے، حافظ صاحب! آپ کے کام کی چیز ہے، بازاری ایڈیشنوں کی طرح مذبوح اور مجروح نہیں۔ اصلی چیز"

حافظ صاحب نے باقرات لاحول پڑھی،

ناظم صاحب نے پوچھا "یار اب تک لوگ اس خرافات کے مجموعے کو پڑھتے ہیں؟"

میں نے اپنے ادبی انداز میں کہا "واہ ناظم صاحب، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ عرب افسانہ نویسی کے موجد ——"

"ہاں، ہاں" نسیم نے بات کاٹ کر کہا "یار جانے دو، اس وقت تم سے ادب اور افسانہ نویسی پر لیکچر سننے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔ تذکرہ تو صرف یہ تھا کہ ——"

نو وارد نوجوان نے نہایت شیریں لہجے میں بات کاٹ کر کہا "قطع کلام ہوتا ہے معاف فرمائیے گا۔ آپ کس اعتبار سے الف لیلہ کو خرافات کا مجموعہ کہتے ہیں۔ یہی ہے نا

اِس میں ایسے واقعات درج ہیں جو بالعموم پیش نہیں آتے، تو حضرت میرا خیال تو یہ ہے کہ اس قسم کے افسانوی ادب کا مقصد یہ ہے۔ کہ ایسے حالات و واقعات کا بیان کرے جو پیش آ تو نہیں سکتے لیکن پیش آنے چاہئیں، عین اسی طرح جس طرح خوفناک افسانوں کے مصنف کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے واقعات بیان کرے جو پیش آتے تو ہیں۔ لیکن پیش نہیں آنے چاہئیں ——————"

تمہید حوصلہ فزا تھی، میں نے نسیم کی طرف، اور نسیم نے میری طرف دیکھا، آخر میں نے کہا، "حضرت، ان الفاظ سے ہمیں ایک ناشنیدہ افسانے کی خوشبو آتی ہے"

نوجوان مسکرایا۔ لیکن چپ رہا۔

نسیم نے کہا "کہئے نا، جو کچھ افسانوی ادب کے متعلق آپ کہہ رہے تھے۔ اس کے لئے آپ کے پاس کوئی واقعی ثبوت ہے نا؟"

نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا،

اب حافظ صاحب بھی چونکے اور فرمانے لگے، "تو پھر بسم اللہ، بھوپال تک گاڑی کوئی گھنٹہ بھر میں پہنچے گی، ایک افسانہ ہی رہے"

نوجوان پھر مسکرایا اور ——————،

قصّہ شہزاد اور مصری جادوگر کا

"حضرات! بھوپال کی سرزمین میرا وطن ہے۔ پشت ہا پشت سے میرے آباد اجداد یہاں مقیم چلے آئے ہیں، میرے والد شروع سے تجارت کی طرف مائل تھے، مجھے بھی انہوں نے تاجرانہ تعلیم دلوائی، اور جب مصر سے ہمارے تجارتی کاروبار شروع ہوئے تو انہوں نے مجھے مصر بھیج دیا۔ جہاں میں چار سال رہ کر تجارت کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو گیا،

پچھلے سال کا واقعہ ہے، میں قاہرہ میں مقیم تھا، ایک رات کھانا کھا کر باہر نکلا۔ تو اپنی دھن میں آبادی سے دور نکل گیا، خیالات میں محو چلا جا رہا تھا کہ ایک دردناک آواز سن کر چونک گیا ——

حافظ جی زیرِ لب، "تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں!"

"سڑک کے کنارے، جس طرف سے آواز آ رہی تھی، ایک مکروہ اور گھناؤنا کپڑوں کا انبار پڑا تھا۔ جس میں سے بار بار ایک نوائے دلخراش بلند ہوتی تھی، میں بادلِ ناخواستہ قریب گیا، کیونکہ فطرتاً مجھے غلیظ فقیروں سے گھن آتی ہے۔

اس انبار میں سے پھر ایک صدا بلند ہوئی، دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بڑھیا فقیرنی ہے چہرے پر چیچک کے داغ، آنکھیں گہرے گہرے حلقوں میں دھنسی ہوئی، پیلی پیلی جلد، سکڑی ہوئی کھال، چہرے پر جھریوں کا جال، پستہ قد، اور حضرات! اس قدر فرسودہ اور کہنہ کہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس عورت پر کرب و ملال کی واقعی صدیاں گذر چکی ہیں۔

میں قریب گیا تو اس نے میری طرف دیکھا، اور اسکی آنکھوں میں ایسا رحم طلب بے پناہ رنگ تھا، جس طرح ایک مجروح جانور کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ جو نہیں جانتا، کہ اسے کیوں تکلیف ہو رہی ہے، اور نہیں سمجھتا وہ کس طرح کسی عذاب کا سزاوار ٹھہرا ہے

باور فرمایئے کہ اس ایک نظر کے اثر سے میرے نظام ذہنی میں ایک انقلاب آگیا اس گھناؤنے اور مکروہ جسم سے میری نفرت زائل ہو گئی، ایک بڑھیا فقیرنی کی بجائے مجھے صرف ایک بے کس اور مظلوم عورت ——————— صرف عورت نظر آرہی تھی،

میرے دل میں یکبارگی رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے، دوزانو ہو کر بیٹھ گیا، اس کا سر اپنے آغوش میں رکھ لیا، اور ———————

اور ———،،

نوجوان پھر مسکرایا، اور اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا، اسوقت

میں نے دیکھا کہ اسکی درمیانی انگلی میں ایک انگشتری تھی جس میں زمرد کا نگینہ تھا۔ اور اس نگینے پر الف (ا) کندہ تھا،

حافظ صاحب کھنکارے، نسیم نے میری طرف دیکھا، گویا داد چاہتے ہیں کہ دیکھا، خوش ذوقی کو میں کس طرح پہچانتا ہوں ــــــ

نوجوان نے سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا "میں نے، ــــ

جسے غلاظت کی ــــــ بوسے قے آتی تھی ــــــــ اس فرسودہ کہنہ فقیرنی کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا، اس بات کا فوری اثر ہوا ــــــ بڑھیا اُٹھی، اور پیشتر اسکے کہ میں تعجب بھی کر سکوں، میری طرف ایک خاص انداز میں دیکھتی ہوئی رات کے سایوں میں غائب ہو گئی ــــــــ

دوسرے دن مجھے شام کی ڈاک سے ایک پارسل ملا جس میں ایک انگوٹھی تھی،

یہ کہہ کر نوجوان نے اپنے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی پیش کی،

اُس انگوٹھی پر جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں (الف) کندہ ہے، آپ واقف ہیں کہ الف کے معنی عربی میں ہزار کے ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے زمردی نگین کے ارد گرد ایک سانپ کی شکل بنی ہے، یہ سانپ فراعنۂ مصر کے ایک خاندان کا شاہی نشان تھا۔ یہ سمجھ

کر کہ کسی تاجر نے انگوٹھی بھیجی ہے۔ اور اپنا نام اور پتہ لکھنا بھول گیا ہے۔ میں نے شام کو یہ انگوٹھی اپنے ایک مصری دوست خالد بے کو دکھائی۔

خالد بے کی حالت اس انگشتری کو دیکھ کر غیر ہو گئی۔ اور اس نے کرید کرید کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ انگشتری میرے ہاتھ کیسے لگی۔ میں نے تفصیلات بیان کیں۔ خالد بے کبھی انگوٹھی کی طرف دیکھتا کبھی میری طرف، آخر جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تو میں نے پوچھا کہ آخر کچھ کہو گے یا یوں ہی احمقوں کی طرح اس انگوٹھی کی طرف دیکھتے جاؤ گے قصہ کیا ہے۔

بہت حیل وحجت کے بعد خالد بے نے کہا "آپ کو علم ہو گا کہ یہ انگشتری فراعنۂ مصر کے ایک خاندان کی شاہی انگشتری ہے جسے سوائے شاہی خاندان کے اراکین کے کوئی نہیں پہن سکتا تھا، اس کے متعلق یہ افسانہ مشہور ہے۔ کہ آج سے کئی ہزار سال پہلے ایک مصری شہزادی اپنے منگیتر کی بدصورتی سے بددل ہو کر ایک معمولی مصری کے ساتھ بھاگ گئی تھی، یہ جوڑا مصر میں جگہ جگہ پھرتا رہا، اور افلاس سے تنگ آ کر مصری شہزادی کی محبت کا جوش ٹھنڈا ہونا شروع ہوا، ایک دن اس مصری شہزادی کا عاشق شہزادی کو ایک جھونپڑی میں چھوڑ کر ایک جادوگر کے پاس گیا۔ اور وہاں اُسکے کرشموں کو دیکھ کر درخواست کی کہ اسے دکھائے کہ شہزادی اس وقت کیا کر رہی ہے مصری

جادوگر نے ایک شیشے کے گلاس کی طرف اشارہ کیا اس میں نامراد عاشق نے شاہزادی کو ایک اور آدمی کی آغوش میں ہنستے ہوئے دیکھا اور غم واندوہ میں گویا دیوانہ سا ہو گیا۔ مصری نے جادوگر کی گردن پر تلوار رکھدی اور کہا کہ سخت سے سخت سزا شہزادی کیلئے تجویز کرے اور اپنے جادو سے اسکی مدد کرے۔ جادوگر نے جان کے خوف سے شہزادی کو مسحور کر دیا اور جس طلسم و نیرنگ میں شہزادی کو مسحور کیا گیا وہ یہ تھا۔ کہ شہزادی ایک نوّے سال کی بڑھیا ہو جائیگی، اور بازاروں میں بھیک مانگتی پھرے گی۔ اسکی خوبصورتی، مکروہ اور گھناؤنی بدصورتی میں تبدیل ہو جائیگی۔ اور جب تک ایک ہزار آدمی محض ہمدردی سے مجبور ہو کر اسکی پیشانی پر بوسہ نہ دیں گے۔ اس وقت تک اپنی اصلی حالت پر نہ آئے گی، چنانچہ مصر والوں کا عقیدہ ہے کہ ہزاروں سال سے یہ بڑھیا مصر میں پھر رہی ہے جب کوئی آدمی اسکی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے۔ تو وہ اسے ایک انگشتری بھجوا دیتی ہے۔ اور اس پر بوسوں کا نمبر شمار کندہ ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر خالد بے نے پھر انگوٹھی کی طرف دیکھا۔ اور کہا "دیکھئے اس پر الف کندہ ہے، یہ آخری بوسہ تھا، یعنی ہزارواں، اب شہزادی اپنی اصلی صورت پر آچکی ہوگی ——————

مجھے اس بات کا فطرتاً یقین نہیں آیا، خالد بے چلا گیا، اور میں دیر میں ہنستا رہا کہ لوگ بھی کیسے ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں، اسی شام مجھے ہوٹل کے ملازم نے ایک

خط لا کر دیا۔ جس میں صرف یہ مندرج تھا "مسجد حسن کے پاس دائیں طرف تیسرے مکان میں آج شام کو سات بجے آؤ"

حضرات! آپ جانتے ہیں، جوانی، چناں کہ افتد دانی! خط عطر سے مہک رہا تھا تحریر نسوانی تھی، میری رگوں میں جوانی کا خون موجزن تھا، نتیجہ ظاہر تھا، میں گیا ——— اور میں نے دیکھا ——— ایک حور شمائل، نظر فریب، پیکرِ عشوہ و ناز، پُر اسرار، مشرق کی تمام رعنائیوں کی حامل، مصر اور قاہرہ کی تمام رومانوی فضا کی نمائندہ ——— حریری ملبوس میں ایک نجم روشن! ایک ماہِ کامل!

والبد حسناؔن سفر

وہ میری طرف دونوں ہاتھ بڑھائے بڑھی اور میں نے اس کے دائیں ہاتھ میں اسی قسم کی پُر اسرار انگشتری دیکھی جیسے مجھے موصول ہوئی تھی

———"

نوجوان خاموش ہو گیا

حافظ صاحب نے بے تابی سے کہا "اور پھر"

"پھر" نوجوان نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے سینے میں دفن ہے"

میں نے پوچھا "لیکن یہ تو فرمائیے ——"

لیکن جو کچھ میں پوچھنا چاہتا تھا شور میں گم ہو گیا، گاڑی بھوپال کے پلیٹ فارم پر تھی، اور خوانچہ والوں کی صدا، مسافروں کی چیخ پکار سے کان کے پردے پھٹے جاتے تھے،،

نوجوان نے اپنا سوٹ کیس سنبھالا، گاڑی رکی، ایک بزرگ، ادھیڑ عمر کے کمرے میں داخل ہوئے اور نوجوان کو دیکھ کر بڑے تپاک سے ملے۔ نوجوان بھی گرمجوشی سے ملا، اور یہ کہہ کر "کہ آپ بھوپال لوٹیں گے تو باتیں ہوں گی" اُتر گیا

کچھ عرصہ کمرے میں خاموشی رہی، آخر میں نے ان بزرگوار سے پوچھا "حضرت، معاف فرمائیے گا۔ یہ صاحب جو اب تشریف لے گئے ہیں، کیا بھوپال ہی کے رہنے والے ہیں،،

"جی" انہوں نے مختصراً جواب دیا،

ناظم نے پوچھا "تو مصر کتنے سال گذارے ہیں انہوں نے"

بزرگ نے حیرت سے ناظم کی طرف دیکھا اور پھر کہا "مصر تو یہ کبھی گئے ہی نہیں یہاں بھوپال میں محکمۂ آثارِ قدیمہ میں ہیڈ کلرک ہیں،،

میں نے ذرا زور دے کر کہا "آپ کو یقین ہے کہ یہ مصر کبھی نہیں گئے"

بزرگ نے تیوری ڈال کے کہا "جی، یقین ہے، میرے سامنے کھیلے اور بڑے ہوئے، ساری عمر بھوپال ہی میں رہے۔"

پھر یکبارگی، ہماری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ "اخاہ! کہیں کوئی افسانہ تو نہیں سنایا آپ کو بھئی، بہت شریر لڑکا ہے ——"

ہم سب متانت سے کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے تھے، اور ان بزرگوار کو بار بار ہنسی کا دورہ پڑتا تھا، !!!

اگست سنہ ۱۹۳۵ء

شبِ نگار بنداں

بہ خیالِ نقش و رنگم زدو دیدہ خواب بردں

خم ابروئے نگاریں چو شبِ نگار بنداں

"نظیری نشاپوری"

شبِ نگارِ بنداں

محمد رضا کو میں دس پندرہ سال سے جانتا ہوں، بس جیسے شاعر ہوا کرتے ہیں بعین فین ویسا ہی ہے۔ انداز لاابالی، لباس کی طرف سے بے پروا، کبھی بے وجہ ہنس رہا ہے، کبھی بے وجہ چپ لگ گئی ہے۔ شعر بھی بُرے نہیں کہتا، ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے قطع نظر کر لیجیے، تو بڑے مزے کا آدمی ہے۔ میں نے اور اس نے ایک ہی سال بی اے پاس کیا تھا۔ ہم دونوں مورد عتاب تھے، دونوں پر پروفیسروں کی خفگی اکثر نازل ہوا کرتی تھی۔ دونوں کو فیل ہونے کا یقین تھا۔ اس لئے ہم دونوں میں ایک طرح کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

جب بی۔ اے کا نتیجہ نکلا۔ اور ہم دونوں پاس ہو گئے، تو ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر پہروں ہنستے رہے۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا "اے نالائق تو بھی پاس ہو گیا"

اور میں نے اسی لہجے میں پوچھا "شیطان کیا یونیورسٹی والے چوک گئے"

یہ آج سے سات آٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کے بعد میں تو معاش کے سلسلہ میں کلکتہ چلا گیا۔ اور رضا لاہور ہی پر بیس برانچ میں ملازم ہو گیا، خط و کتابت کے معاملے میں بقول بخاری۔ میں بہت غنچہ دہن واقعہ ہوا ہوں۔ کلکتہ ایک دو خط رضا کے مجھے ملے، مضمون یہی کہ تم بڑے نالائق ہو جی، تم خط نہیں لکھتے ہو جی،

کچھ اس طرح یاد آتا ہے۔ کہ میں نے ایک آدھ خط کا جواب بھی دیا تھا لیکن مجھے اپنے حافظے پر اتنا بھروسہ نہیں جتنا خط نہ لکھنے کی عادت کا یقین ہے۔ اس لئے سوچتا ہوں شاید جواب نہ دیا ہو، کیونکہ ایک دو سال کے بعد رضا کا کوئی خط نہیں آیا، چھ سال کے بعد میری بدلی لاہور ہوئی۔ رضا سے ملنے کو جی چاہا بھی لیکن کچھ موقع ہی نہیں ملا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا۔ کہ وہ ابھی تک شادی سے اپنا پنڈ چھڑاتا پھرتا ہے۔ میرے خیر سے کئی بچے تھے، یوں بھی کچھ مصروف، مختصر یہ کہ جلدی ملاقات نہیں ہوئی،

ایک دن کی بات ہے کہ میں دو تین دوستوں کے ساتھ شام کی چائے انار کلی کے پاس ایک ہوٹل میں پی رہا تھا، کہ رضا بیٹھا ہوا نظر آیا، اس نے بھی مجھے دیکھا۔ اور ہم دونوں اُٹھ کر ایک دوسرے کی طرف لپکے اور دونوں کے منہ سے یکبارگی نکلا "تو ہے بے ہودہ کہیں کا،،

"تو تو ہے بیہودہ کہیں کا"

میں نے ہنس کر کہا "تجھ سے یونیورسٹی والوں نے ابھی تک ڈگری تو نہیں چھینی"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "ابھی تک تو نہیں چھینی ——— اور تجھ پر دفتر والوں نے غبن کا دعوے تو نہیں کیا۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو نہیں کیا"

پھر ہم دونوں بیٹھ گئے، چھ سال کا بخار اسی ایک نشست میں نکال ڈالا کالج کے پروفیسروں سے لیکر سلوچنا کے ایکٹنگ تک، ہر قسم کے موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کیا، ٹھنڈی چائے کے گھونٹ بھرتے رہے۔ سگریٹ پیتے رہے۔ باتیں کرتے رہے، اٹھنے سے ذرا پہلے میں نے پوچھا "ابھی شعر کہتا ہے تو؟"

اس نے میری طرف ایک عجیب سے انداز میں دیکھا، پھر مسکرا کر کہا "اب تو نہیں کہتا"

کچھ عرصہ چپ رہنے کے بعد اب اس نے مجھ سے پوچھا "اور تو نے کیا کسی سے شادی گانٹھ لی"، تو کہا کرتا تھا۔ نہ کہ میں شادی نہیں کرونگا۔

میں نے کہا "کیا بے ہودہ بکواس ہے۔ اب ہم گھر والے ہیں، ایک عدد گھر والی اور تین عدد بچے رکھتے ہیں ——— سنتا ہوں تو ابھی تک لنڈورا پھر رہا ہے"

وہ ہنسنے لگا، لیکن اسکی ہنسی مجھے کچھ جھوٹی سی، کچھ پھیکی سی معلوم ہوئی۔ اپنے زخموں کو چھپانے کے لئے ہم اکثر ایسی ہنسی ہنسا کرتے ہیں، مجھے کچھ شک سا ہو گیا، میں کرید کر پوچھتا، لیکن ساتھ کے دوستوں نے ہڑبونگ مچادی، کہ اُٹھو، اب چلو گے بھی یا نہیں، کیا کر رہے ہو ——— اور میں جلدی میں صرف رضا کا پتہ پوچھ سکا۔ اور اِسے اپنا پتہ بتا سکا ———

(۲)

اس واقعہ کے سات آٹھ دن بعد وہ ایک شام میرے مکان پر آیا۔ اس دن شادی کا ذکر کرتے ہوئے، جو اس کے انداز میں میں نے ایک تبدیلی سی محسوس کی تھی۔ وہ آج اسے بیک نظر دیکھتے ہی پھر محسوس ہوئی، وہی رضا تھا۔ وہی ستوان ناک، کشادہ پیشانی، سانولا رنگ، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، لیکن جیسے اداس سا، کچھ دکھی سا معلوم ہوتا تھا۔ میرے پاس آکر اس طرح بیٹھ گیا جیسے تھک سا گیا ہو۔ کچھ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میں نے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ لیکن اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں"

آخر یکبارگی کہنے لگا: "یار بڑی الجھن میں جان ہے"

میرے اس پوچھنے پر کہ "کیوں الجھن میں جان ہے"، کچھ عرصہ پھر چپ رہا۔ پھر خود کہنے لگا۔

"یار مجھ سے کہتے ہیں شادی کرلو، اور اب ضد کر رہے ہیں، کئی بار کہہ چکا ہوں - کہ میں شادی نہیں کرتا کوئی سنتا ہی نہیں، یہ پوچھتے ہیں - کہ وجہ بتاؤ، وجہ بتاؤ، وجہ بتاؤ"؛

میں نے یہ نہیں پوچھا، کہ کون کہتے ہیں شادی کرو سمجھ گیا - کہ اسکی مراد والدین سے ہے - وہ پہلے بھی ان کا ذکر اسی طرح صیغہ جمع غائب میں کیا کرتا تھا - اور میں جانتا تھا، کہ اس جمع کی ضمیر کس طرف پھرتی ہے،

میں نے اتنا ضرور کہا۔" تو وجہ بتاتے کیوں نہیں "

میری یہ بات سُن کر جل گیا - اور جھلا کر کہنے لگا" تم ویسے ہی احمق ہو - وہی بچوں والی باتیں کرتے ہو، ہر بات کی وجہ لیا بتائی جانے والی ہوتی ہے"؛

اس کے جواب میں میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا ، مثلاً یہ کہ میں کیسا احمق ہوں - اور وہی بچوں والی باتیں کون سی کرتا ہوں - لیکن مجھے اس وقت معلوم ہوا گویا اس وقت میں نے مذاق کیا تو بگڑ جائیگا - یہ بھی نہیں پوچھا، کہ نہ بتائی جانے والی وجہ، وجہ کی کونسی قسم ہوتی ہے - ہاں بس اتنا کہا" تو بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں"

اس کے جواب میں اس نے ایک طول طویل تقریر کی، جسکا ماحصل یہ تھا - کہ تم بڑے نیک، شریف اور سعادت آثار ہو، تمہاری بات سب لوگ مان لیں گے، تم ان سے کہہ دو - کہ حالات کچھ ایسے ہیں - کہ شادی ناممکن ہے، تم بڑے اچھے دوست

ہو تم میرا کام ضرور کرو گے، دوست مصیبت کے وقت کام آیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح بہت عرصہ تک بیہودہ بکتا رہا میں چپ چاپ بیٹھا۔ اسکی تقریر سنتا رہا جب وہ ختم کر چکا تو میں نے بھی اسکے جواب میں ایک اس سے زیادہ طویل تقریر کی میں تمہارے لئے جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ والدین کو سمجھانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ان کو چھوڑ کر پھر برادری کے بزرگ ہوتے ہیں۔ لیکن میں پوری کوشش سے اپنا فرض ادا کرونگا وغیرہ وغیرہ اور یہ آخر میں کہا "شرط یہ ہے۔ کہ تم مجھے اصلی وجہ بتاؤ۔ کہ تم شادی کیوں نہیں کرتے"

یہ بات سن کر وہ پھر چراغ پا ہو گیا۔ لیکن میں نے اسے روک دیا۔ اور کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر تم مجھے بھی وجہ نہ بتاؤ گے تو میں ہرگز کسی قسم کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہونگا۔"

یہ بات سُن کر وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ لیکن جلدی اسکی سمجھ میں آگیا۔ کہ میں وجہ سننے کا مشتاق تھا، کچھ عرصہ کرسی کے ساتھ پیٹھ لگا کر گردن نیہوڑائے میری طرف دیکھتا رہا آخر بولا" یار تم میرا قصہ سن کر ہنسو گے، یہ بات ہی کچھ ایسی عجیب و غریب ہے۔ کہ مجھے اکثر اوقات خود اپنے اوپر ہنسی آتی ہے کہ میں کس موہوم چیز کے لئے اپنی جان کھو رہا ہوں۔ لیکن یار سچ تو یہ ہے۔ کہ اُس دن سے میرے دل میں کچھ ایسی کسک سی پیدا ہو گئی ہے کہ شادی کی طرف رغبت ہوتی ہی نہیں، بس یہی جی چاہتا ہے۔ کہ اس رات کی یاد میں زندگی

گزار دوں، تم سمجھو گے شاعری کر رہا ہوں۔ شاعر ہوں آخر، لیکن یقین کرنا میں غیر شاعرانہ سچ بول رہا ہوں"

میں نے اسے اطمینان دلایا۔ کہ اسکی کہانی سن کر ہنسنا تو درکنار مسکرانا بھی حرام سمجھونگا۔ تب اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ میں اسی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں، بعض بعض موقعوں پر اس نے جس بیتابی کا اظہار کیا ہے۔ اور جیسی جیسی ٹھنڈی سانسیں بھری ہیں۔ اس میں ایک خاص کیفیت تھی جو میں پڑھنے والوں تک منتقل نہیں کر سکتا۔

۳

کہنے لگا: "چار سال ہوئے ہیں میری بہن کی سسرال میں کسی کی شادی تھی مجھے بھی مجبور کیا گیا کہ ساتھ چلو جب ہم شادی والے شہر میں پہنچے (اس نے شہر کا نام لیا تھا لیکن میں بوجوہ اخفا مناسب سمجھتا ہوں) تو ہمارے گھر کے مردوں اور عورتوں کو ایک ہی مکان میں اتارا گیا۔ مجھے دو مردوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونا عذاب جان معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اترتے ہی رشیدہ سے کہا تم جانتے ہو نا میری بہن کا نام رشیدہ ہے، ابھی مجھے ایک علیحدہ کمرہ دلوا دو چاہے چھوٹا ہی ہو۔ تو اس نے کسی نہ کسی طرح یہ بندوبست کر ہی لیا جس مکان میں ہم اتارے گئے تھے۔ اسکی صورت یوں تھی۔ کہ داخل ہوتے ہی ایک کھلا

صحن ملتا تھا۔ برآمدے سے گذر کر سامنے کے کمروں میں عورتیں ٹھہرائی گئیں۔ ان کمروں کے ساتھ ہی ایک کوٹھڑی تھی جسکا ایک دروازہ اس کمرے میں کھلتا تھا جسمیں عورتیں ٹھہرائی گئی تھیں، اور ایک دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا۔ اسکے ساتھ دو تین بڑے کمرے تھے جہاں مرد اتارے گئے تھے۔ میں نے اپنا بستر اور سوٹ کیس کوٹھڑی میں جمایا۔ اور سیر کے لئے نکل گیا۔ گھوم کر شام کو آیا تو دولہا میاں کے دوست چوکڑی مچا رہے تھے۔ بیزار ہو کر پھر اپنی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ مشکل سے دس منٹ بیٹھے ہوئے ہونگے کہ جو دروازہ زنانہ کمرے میں کھلتا تھا۔ وہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں نے پوچھا کون ہے۔ رشیدہ کی آواز آئی۔ کہ بھائی جان آپ ہیں۔ میرے جواب دینے پر وہ کوٹھڑی میں آگئی۔ اور ہنس کر کہنے لگی۔ بھائی جان آپ کو کچھ لڑکیاں دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا ——— مجھے دیکھنا چاہتی ہیں؟ رشیدہ نے ہنس کر کہا ہاں۔ میرے پوچھنے پر کہ کہیں تو میری شادی کا منصوبہ تو نہیں گانٹھ کر آئی۔ اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ نہیں۔ اور جب میں نے کرید کرید کر پوچھنا شروع کیا۔ تو کہا۔ وہ کہتی ہیں کہ ہم دیکھنا چاہتی ہیں۔ شاعر اور مضمون نگار کیسے ہوتے ہیں۔ میں نے اسے بہتیرا سمجھایا۔ کہ تم نے کیوں نہ کہہ دیا۔ کہ ویسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسے اور آدمی، لیکن وہ ضد کئے گئی کہ آپ مان جائیں۔ اور سنبھل کر ہو بیٹھیں۔ دیکھنے والیاں آپ کو دروازے کا ذرا سا پٹ کھولکر دیکھ لیں گی۔ کوٹھڑی میں

روشنی ہوگی۔ دوسری طرف اندھیرا۔ خیر میں مان گیا۔ اور بقول رشیدہ کے میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ رشیدہ نکل کر ساتھ کے کمرے میں گئی۔ کچھ عرصہ کھڑ پھڑ کی آوازیں آتی رہیں۔ کبھی کبھی ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز بھی آجاتی تھی۔ آخر خاموشی طاری ہوگئی۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ دروازے کے پٹ کے ساتھ لگی مجھے دیکھ رہی ہیں۔ اس وقت اس کوٹھڑی میں تنہا تھا۔ اتنی نظروں کا نشانہ بن کر بیٹھنا مجھے بینقوں کا سا کام معلوم ہوتا تھا۔ لیکن خیر اب تو جو ہونا تھا ہو لیا۔ ایک منٹ کے بعد کسی نے ہولے سے کہا بڑی مہربانی اب آپ آرام سے بیٹھ جائیں ——— اس پر اندر سے قہقہہ پڑا۔ اور میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اسوقت اگر رشیدہ میرے سامنے آتی تو اسکی خیر نہیں تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں کچھ اور تو سوجھا نہیں اپنا لمپ بجھا دیا اور پھر خود ہی جب باہر نکلنا چاہا تو اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ خیر جوں توں مردانے میں پہنچا۔ کھانا کھایا۔ اور پھر کوٹھڑی میں لیٹ گیا۔

مجھے یاد نہیں کہ نیند کب آئی اور کتنا عرصہ سویا رہا۔ گلابی سردیوں کے دن تھے۔ پتلا سا لحاف اوڑھ کر لیٹا تھا۔ یا تو یہ یاد ہے کہ سو گیا تھا۔ یا پھر یوں محسوس ہوا گویا کسی نے میرے سر پہ سے لحاف کھینچ لیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ میرا ہاتھ دبا رہا ہے! اندھیرے میں کچھ نظر تو آیا نہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کون ہے کون۔ ساتھ ہی کسی نے ہولے سے

اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ اور اس ہاتھ سے مجھے اس طرح کی خوشبو آئی جیسے موتیے کے پھولوں میں بسے ہوئے رومالوں کی ہوتی ہے۔ میں نے ہاتھ سے آہستہ سے اپنے مُنہ پر سے ہاتھ اُٹھایا۔ اور مجھے اپنی انگلیوں پر نہایت سبک اور نازک انگلیوں کا دباؤ محسوس ہوا۔ اور ساتھ ہی معلوم ہوا کہ کوئی میرے پلنگ پر لحاف ہٹا کر بیٹھ گیا۔ جو مجھے اس کے جسم کی گرمی محسوس ہوئی اور میری کمر کا وہ حصہ جو کسی کے گداز جسم سے مس ہو رہا تھا۔ دہکتے ہوئے کوئلے کی طرح جلنے لگا۔ میں نے گھبرا کر اُٹھنا چاہا لیکن وہی سبک اور نفیس انگلیاں اب میرے دائیں بازو کو دبا رہی تھیں گویا اُٹھنے سے روک رہی تھیں۔ اب اس کا سانس مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہوا۔ اور ہلکی ہلکی مہک سے جس طرح خوشبو کا ایک لہر سا ہو میرے بدن میں سنسنی پیدا ہونے لگی۔ اب اس کا منہ میری چھاتی پر جھکا ہوا میرے منہ کے بالکل پاس تھا۔ اسکے بال میرے بالوں میں مل گئے تھے۔ پھر مجھے اپنے گال پر نرم نرم جلد کا لمس محسوس ہوا۔ اور وہ انگلیاں جن میں سے موتیا کے پھولوں کی سی خوشبو تھی مجھے اپنے ماتھے کو چھوتی محسوس ہوئیں۔ اب تک تو میں گویا سُن تھا۔ یکبارگی میں نے ان انگلیوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور جھکے ہوئے سر کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ پھر آہستہ آہستہ سے پوچھا تم کون ہو۔ اسکا کوئی جواب نہیں ملا۔ صرف مجھے اپنی چھاتی پر اسکے سر کی حرکت

معلوم ہوئی گویا کہہ رہی ہے کہ نہیں بتاتی۔ اسکے ساتھ ہی اس نے اپنا سر اُٹھا لیا۔ اور اپنا منہ میرے منہ کے پاس لاکر ہولے ہولے اپنے گال میرے گال سے ملے میں نے پھر بیتاب ہو کر پوچھا مجھے اپنا نام تو بتا دو۔ اسکا جواب بھی نہیں ملا۔ ہاں اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے جھٹک کر پرے کر دیئے اور میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ کچھ عرصہ وہ سر اسی طرح رکھا رہا۔ میرا بدن اس طرح کانپ رہا تھا جس طرح ہوا کے طوفان میں خزاں رسیدہ پتہ۔ اسکے بالوں کی خوشبو مجھے بیہوش کر رہی تھی۔ اور اس طرح معلوم ہوتا تھا۔ گویا میں کسی انتہاہ غار میں گرتا جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں کتنا عرصہ وہ سر اسی طرح رکھا رہا۔ میں اسکے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے الجھا رہا تھا۔ اب مجھے اپنے کرتے پر نمی سی محسوس ہوئی اور ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آئی۔ میں یہ سوچ بھی نہیں چکا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کہ وہ نہایت تیزی سے اُٹھی اور پلنگ سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر بڑی منت سے کہا خدا کے لئے مجھے اپنا نام تو بتاؤ۔ اس طرح تو میں دیوانہ ہو جاؤنگا۔ یہ سن کر وہ قریب آئی اور دو انگلیاں میرے لبوں پر رکھ دیں۔ بڑی بیتابی سے مجھے پیار کیا۔ اور پھر پیچھے ہٹ گئی میں نے بھی اُٹھنا چاہا۔ اب میری آنکھیں تاریکی میں کچھ چیزوں میں تمیز کر سکتی تھیں اب میں نے دیکھا کہ جو دروازہ زنانہ کمرے میں کھلتا تھا۔ اسکے ساتھ لگی کھڑی ہے

میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ لیکن وہ جھپٹ کر کمرے کے اس پار ہو گئی۔ ساری رات بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ نیند کیا خاک آسکتی تھی۔ وہی موتیا کے پھولوں کی مہک اور بالوں کی خوشبو کا لہریا ابھی تک اپنے جسم کے ذرے ذرے میں رچا ہوا محسوس کرتا تھا۔ ایک بار اٹھ کر بڑی آہستہ سے دیکھا بھی کہ درمیانی دروازہ کھلا ہے کہ بند۔ بند تھا۔ کھٹکھٹانے کی ہمت نہ ہوئی۔ صبح تک پھر سو یا نہیں۔ دروازے کے ساتھ لگا بیٹھا رہا۔ پھر خیال آیا۔ کہ ادھر سے کسی نے یکبارگی دروازہ کھولا تو اس کمرے میں جا گروں گا۔ اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ صبح تک دروازے کے اس طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ مطلقاً خاموشی رہی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح برات کی روانگی تھی۔ رشیدہ سے ملنے کی کوشش کی لیکن نہ مل سکا۔ واپسی پر بھی رشیدہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کئی بار نوکر بھیجے، نوکروں کے ہاتھ کہلوایا۔ بس یہ کام کر رہی ہیں۔ وہ کام کر رہی ہیں ابھی وہ نہیں مل سکتی۔ اور تو میرا وسیلہ کوئی تھا ہی نہیں جو کچھ سن گن لیتا۔ بس رشیدہ سے لاہور واپس آنے پر ملاقات ہوئی۔ طرح طرح کے حیلوں حوالوں سے پوچھنے کے بعد بس اتنا معلوم ہو سکا کہ اس کمرے میں پندرہ بیس لڑکیاں تھیں اس سے زیادہ نہ کچھ رشیدہ بتا سکی نہ میں پوچھنے کی ہمت کر سکا۔ وہ دن جاتا ہے اور یہ دن آتا ہے۔ کہ رات کو سونے سے پہلے وہ موتیا کے پھولوں کی خوشبو اور بالوں

کی مہک گویا پھر محسوس ہوتی ہے۔ اکثر نیند نہیں آتی۔ یہ کہکر رضا بالکل چپ ہو گیا۔ میں نے بہت سے سوال کئے۔ لیکن اس نے کسی کا جواب نہ دیا۔ اسکی تشفی کیلئے میں نے وعدہ تو کر لیا تھا کہ اس کے والد سے بات کرونگا۔ لیکن دوسرے دن ہی مجھے تار آیا کہ میری چھٹی منسوخ ہو گئی ہے واپس کلکتے چلا گیا۔ وہاں سے ایک دو خط بھی رضا کو لکھے لیکن اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

مجھے اُمید نہیں کہ اسے اس رات کے مہمان عزیز کا سراغ ملا ہو۔ نہیں تو وہ مجھے خط ضرور لکھتا۔

عدالت

دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیائے

"اقبال"

عدالت

ایک مختصر سے سٹیشن کی عمارت میں فوجی عدالت کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک ملزم کو اندر لایا گیا جسے عین موقع پر گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام تھا اس نے ایک مجروح سپاہی کو قتل کر دیا ہے

وہ ابھی جوان تھا۔ زرد رُو۔ خوف کے پسینے میں غرق ۔۔ اس کے لبوں سے جو بندوق کے کندوں سے زخمی کر دیئے گئے تھے۔ خون ٹپک رہا تھا۔ بار بار وہ اپنے آکودہ ہاتھوں سے بہتے ہوئے خون کو چہرے پر مل لیتا تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے زخمی تھے کہ ہڈی نظر آ رہی تھی ۔

ایک نفرت انگیز ——— لرزاں ——— غلیظ اور افسردہ ملزم معیارِ انسانیت سے گری ہوئی ایک گھناؤنی اور مکروہ چیز !

صدرِ عدالت نے اس سے کچھ سوال کئے ۔ ملزم نے جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنا نام بھی بیان نہ کیا۔ وہ ہر طرف خوف اور زہرناک حقارت کی نظریں ڈال رہا

تھا ——— پھر سپاہیوں نے اپنی شہادت دی۔ بڑے شور و غل سے کینہ آمیز احساس کے ساتھ ——— معاملہ بالکل صاف تھا۔ ملزم نے ایک مجروح سپاہی کو قتل کر دیا تھا۔ اور اس کی رِسٹ واچ اُتار رہا تھا۔ کہ پکڑا گیا۔

صدرِ عدالت نے انگلیوں سے میز کو ٹھکراتے ہوئے کہا "مزید سوالات کی ضرورت نہیں۔ فوجی قانون کے مطابق میں اِس شخص کو موت کی سزا دیتا ہوں۔

لے جاؤ!"

ملزم کی سمجھ میں ایک حرف نہ آیا۔ بغیر کسی مدافعت کے وہ مٹر پٹر کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ ساتھ ساتھ اپنے ہونٹوں کو اپنے خون آلود ہاتھوں سے صاف کرتا جاتا تھا۔

مقدمہ ختم ہو چکا تھا!

صدرِ عدالت نے پیٹی کھول کر تلوار ایک طرف رکھ دی اور ہوا کھانے کیلئے سٹیشن سے ذرا دور نکل گیا۔ چاندنی رات تھی۔ ہر چیز مرمریں روشنی میں پتھریلی نظر آتی تھی۔ سفید سڑک۔ سفید چمکتے ہوئے سبزہ زار حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ شفاف سپیدی، مرمریں آرزو۔ ازلی اور دردناک اضطراب! حدِ افق ——— اور حدِ نظر تک۔ منوّر اور دردانگیز خاموشی ——— رات ایک چمکتی ہوئی بے جان رنج بستہ تصویر کی طرح تھی۔ ایک تار اتک نہیں چمکتا تھا۔ روشنی کے آثار فطرت

سے گم ہو چکے تھے۔ کائنات میں کچھ نہ رہا تھا سوائے ایک منجمد نور کے!

صدر عدالت نے اپنا سر جھکا دیا۔ ریلوے سٹیشن کے ویٹنگ روم میں سوئے ہوئے سپاہیوں کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ تاریکی ان صحت مند دل افروز خراٹوں کے ذریعے اپنے آپ کو چاندنی رات کی عظمت سے بچانا چاہتی تھی۔ گویا اپنے خوف کو کم کرنے کیلئے خود تاریکی ان خراٹوں میں بول رہی تھی۔ کسی جگہ اس تاریکی میں ریل کی لائن سے پرے ایک جھونپڑی تھی۔ جہاں ملزم قید تھا۔ اور وہاں تاریکی اور خاموشی تھی۔ اور صرف ایک چھوٹے سے روزن سے خوفناک روشنی داخل ہو رہی تھی۔ صدرِ عدالت کے ماتھے پر اضطراب کا پسینہ آگیا۔ اسے یاد آیا کہ ملزم نے اپنی نگاہیں اسکے ماتھے پر گاڑے رکھی تھیں۔ یکایک پسینے کا ایک قطرہ بہ کر اس کے چہرے پر آگیا ——— ایک اور ——— پھر ایک اور ——— پیشانی آنسو بہا رہی تھی،

افسوس! ——— کیا روشنی کے اس سرد کہرے میں ہر چیز بے جان ہو چکی تھی۔ کسی درندے کی حرکت کا احساس نہ ہوتا تھا۔ کوئی چیز گھاس میں سرسراہٹ پیدا نہ کرتی تھی۔ کسی پرندے کی آواز اس سکوت کو نہ توڑتی تھی۔ تو کیا پھر تمام چیزیں ساکت ہیں ——— صرف ایک حیرت انگیز روشنی اور ایک تنہا انسان! چمکتی ہوئی

لہریں لرزاں۔

یکایک ایک وسیع وعظیم الشان آواز سنائی دی۔ گویا چاندنی بول رہی تھی۔ کوئی قانون نہیں ہے"۔ حاکمِ عدالت کا جسم تن گیا۔ ——— کون یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے۔ کہ دنیا میں کوئی قانون نہیں ہے۔ ہم قانون سے اسی طرح گھرے ہوئے ہیں جس طرح حدود وافق سے۔ اگر ہم قانون سے مجبور نہ ہوں۔ تو کوئی کام کس طرح کرے۔ اگر قانون نہ ہو تو میں اپنے تیس سپاہیوں پر کس طرح حکم چلا سکتا ہوں۔ اگر قانون نہ ہوتا تو میں اس وقت کہاں جاتا۔ قانون نہ ہوتا تو انصاف نہ ہوتا۔ انسان قانون کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قانون فنا ہو جائیگا۔ تو ہر چیز فنا ہو جائیگی اور دنیا بوسیدہ ہو کر گر پڑے گی۔

پھر اسی آواز نے چاندنی کے ذریعے جواب دیا "کوئی انصاف نہیں ہے"۔

حاکمِ عدالت نے احتجاج کیا "تمہیں یہ بات کہنے کی کیسے جرأت ہو سکتی ہے میں نے ملزم کو اس لئے سزا دی تھی کہ اس نے ایک مجروح سپاہی کو مار ڈالا تھا۔ میں نے قانون کے نام پر اسے سزا دی تھی اور اگر قانون نہ ہوتا تو میں اپنے ضمیر کے کہنے کے مطابق عمل کرتا اور اسے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالتا۔ میں اس کا سر پستول سے کچل دیتا"۔

ازلی آواز پھر آئی "کوئی ضمیر نہیں ہے"

صدر عدالت تن کر کھڑا ہو گیا۔ کہ اس خوفناک آواز کا مقابلہ کرے۔ اِس نے جوش میں آکر کہا "پلیٹ فارم کی طرف دیکھو۔ جہاں تین مقتول سپاہی خاک و خون میں پڑے ہیں۔ تین نوجوان جو آج صبح زندہ تھے۔ صبح کے وقت وہ ہنس رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے ——— تم خود بھی مر جاؤ گے۔ صدمے سے غم سے۔ خوف سے۔ اضطراب سے۔ اور دیوانگی کے جوش سے ——— اور راستی کے نام پر تم بھی ملزم کو میری طرح سزا دو گے۔ تم اگر خدا ہو تو بھی وہی کرو گے جو میں نے کیا۔"

وہ آواز جو چاندنی کے ذریعے بولتی تھی خاموش ہو گئی۔ تنہا انسان نے آسمان کی طرف دیکھا جو ایک وسیع سفید گنبد کی طرح منجمد نور سے لبریز تھا۔ پھر آواز آئی۔

"کوئی خدا نہیں ہے۔"

حاکم عدالت کانپنے لگا۔

یقیناً گھاس کا حقیر ترین پیشہ۔ شاہراہ کے ذرے۔ سفید پتھر اور مجرمانہ خون کے وہ قطرے جو دہلیز پر جمع ہوئے ہیں۔ اُٹھ کھڑے ہونگے۔ اور اس آواز کے خلاف احتجاج کرینگے۔ یقیناً یہ تمام چیزیں خدا کی حقانیت پر گواہی دینگی ——— کم از کم وہ کچھ

کہیں گی ——— کم از کم وہ اپنی نفرت کا اظہار کرینگی ———"

لیکن ——— خاموشی! موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ صرف ایک سپاہی نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ حرکت بند تھی نظامِ کائنات خاموش تھا۔

حاکم عدالت نے اپنے بال نوچنے شروع کئے "اُف! میری روح سے اس آواز کے برخلاف کوئی آواز کیوں نہیں نکلتی۔ خدا کی طرف سے کوئی اشارہ کیوں نہیں ہوتا ——— میری کوئی مدد کیوں نہیں کرتا ———؟"

پھر ابدلا۔ ایک سپاہی کھانستا ہوا اُٹھا۔ اور بندوق اپنے کاندھے پر رکھلی حاکم عدالت کو ایک لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ گرم۔ نم، آشنا! اور اس نے اس روشنی کو دنیا کی طرف سے ایک پیغام دوستی سمجھا۔

لائن کے قریب جو لاشیں پڑی تھیں۔ چاندنی کا نقاب انکو ایک خوفناک اور یخ بستہ شکل میں تبدیل کر رہا تھا۔ دور ایک سنگین چمکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ہر طرف سفید چند جیا دینے والی سفید روشنی تھی ——— کچھ نہیں کائنات ——— بس کچھ نہ تھا۔ صرف کائنات تھی۔

ترجمہ

لاہور کی ایک رات

تو نیز ہر آنچہ مے نمائی ہستی ،

"خیام"

لاہور کی ایک رات

شام ہی سے میرا دل اُداس تھا۔ اور شام کے بعد تو گویا دل بیٹھ گیا۔ غروب آفتاب کے وقت مجھے یوں معلوم ہوا گویا مادرِ ایام نے ایک خوفناک خونخوار دیو جنا ہے جو ماں کے خون کے دریا میں تیر رہا ہے —— خدایا! یہ روز و شب کا پیہم تسلسل کب تک قائم رہے گا! اسی طرح کے دن۔ اسی طرح کی راتیں۔ میں اور میرے ساتھی کس طلسم میں گرفتار ہیں۔ دنیا میں کچھ نہیں ہوتا؟ یا میری زندگی ہر حادثے سے خالی ہے! ۔ یوں کیوں نہیں ہوتا کہ کسی دن آفتاب اپنی بے شمار حرارت کی شعلہ کاری سے بھڑک اُٹھے، جل کر خاک ہو جائے اور ساتھ ہی اس دنیا کو بھی اس فرسودہ اور کہنہ نظام کو بھی جلا دے! سمندر کی سرد لوریں فانی اور تاریک۔ تہہ میں سے فساد اور بربادی کی ایک چنگاری کیوں نہیں نکلتی؟ یا پھر سمندر میں ایک حیرت انگیز اور عالمگیر طوفان کیوں نہیں آتا۔ کہ دنیا اس وسیع قطعہ آب میں ایک چھوٹے سے حقیر پتھر کی طرح غرق ہو جائے!

ان خیالات کی جذباتی شدّت میں رات کے دس بجے تک کمی نہ ہوئی۔ نیند نہ آتی تھی ——— کروٹیں لینے کا کوئی فائدہ نہ ہُوا۔ آخر کپڑے پہن کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ اگرچہ گرمیوں کے دن تھے۔ لیکن ہوا میں خُنکی تھی۔ باوجود اس خنکی کے ہوا مجھے اپنے منہ پر اس طرح محسوس ہوتی تھی گویا کسی نے اپنا نرم اور گداز ہاتھ میرے گالوں پر رکھ دیا ہے ——— دو رویہ مکانوں میں سے آسمان ایک چھوٹے سے کالے پانی کے دریا کی طرح نظر آرہا تھا جس میں ستارے چمک رہے تھے۔ گلیاں مڑئی تھیں۔ تو ان کے پیچ و خم کے ساتھ ساتھ یہ دریا بھی ایک حقیقی دریا کی طرح پیچ و خم کھاتا ہوا ستاروں سے چمکتا ہوا میرے ساتھ چلتا تھا۔

مجھے یاد نہیں کتنی دیر چلتا رہا ——— سٹیشن کے پاس پہنچ گیا سٹیشن کی عمارت بجلی کی بتیوں سے روشن تھی۔ شاید کوئی گاڑی آتی تھی۔ تانگوں کے اڈے پر کچھ تانگے والے اونگھ رہے تھے۔ آوازیں سُن کر چونکے ——— مسافروں کو بلانے لگے ——— کچھ لوگ گھڑیاں اُٹھائے میرے پاس سے گذرے ——— ایک جاٹ عورت ان کے ساتھ تھی۔ تیز بجلی کی روشنی میں اسے میں نے اچھی طرح دیکھا۔ قد پانچ فٹ کچھ انچ۔ سانچے میں ڈھلا ہوا جسم

موٹے سفید کھدر کا تہمد۔ کالا دوپٹہ۔ اسکی رانوں کی گدازی اور پنڈلیوں کی مضبوطی کپڑوں کے جھول میں چھپ نہ سکتی تھی۔ گندمی رنگ صحت سے تمتایا ہوا سرخ۔ چال شاہانہ گویا لاہور فتح کرنے کیلئے آئی ہے۔ وہ دونو طرف اس طرح دیکھتی تھی جس طرح فاتح بلکہ اپنے نئے مقبوضات کی طرف دیکھتی ہے —— شاید اس نے ابھی شہر کی کامنی زرور وناز نینوں کو نہیں دیکھا۔ ورنہ انداز میں اس سے زیادہ غرور اور چال میں اس سے زیادہ تمکنت ہوتی۔

میں سٹیشن کے ساتھ ساتھ چل دیا —— آمدورفت کم ہوگئی تھی۔ دور دو تین بیل گاڑیاں آرہی تھیں ان کی لالٹینوں کی روشنی تاریکی کو کسی حد تک رفع کر کے میرے قریب کی تاریکی کو اور زیادہ گہرا کر رہی تھی —— پہیوں کی آواز کے ساتھ ساتھ گانے کی آواز آرہی تھی

نی میں کاہنوں گلاں کیتیاں بلوچاں دے نال

پنجاب کے ایک جواں مرد فرزند —— ایک تنومند جاٹ کی آواز ہے لیکن لہجہ کتنا دردناک ہے۔ جب تک گاڑی میری ادجھل نہیں ہوئی۔ اسی طرف دیکھتا رہا۔ آواز مدھم ہوتی ہوتی گم ہوگئی۔ لیکن میرے دل میں ایک گونج ایک خلش سی چھوڑ گئی —— تو یہ شہروں کا عشق بھی شاید شہریوں کی طرح مریض زرد رد

اور نازک ہے۔ ہاں گاؤں میں اب بھی کئی رانجھے، کئی پنوں ہونگے۔ ان کا جوان عشق ان کی طرح بے باک اور نڈر ہوگا۔ شہر کے عشق کی طرح وہ رات کے پردے میں چھپ کر ہوس کی سیاہ کاری کو محبت کی سحر کاری کا نام نہیں دیتا۔ وہ کھلے بندوں ہیر پر اور سسّی پر قربان ہوتا ہے۔ انجام سے ڈرنے والا عشق شہر میں ہے اور آغاز سے انجام تک ایک ہی ڈگر پہ چلنے والا عشق شاید گاؤں میں ——

یہاں شہروں میں حسن —— سرمہ آلود آنکھوں سے جھانکتا ہے۔ اور دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ کہ وہ تاباں در و شن رخسار دیکھیں جن پہ پوڈر نے جلا کی ہے، ان سیاہ باریک ابروؤں پر ایک نظر ڈالیں جن کو ایک ماہر فن کار نے تراشا ہے۔ ان لبوں کی داد دیں جنکی سرخی کیلئے انگلستان کے کسی کارخانے میں مزدوروں نے شبانہ روز محنت کی ہے۔ ان ہلالی ناخنوں کی قدر کریں جن کو حنا نے خون کا رنگ دیکر دلکش بنا دیا ہے۔

اور وہاں —— گاؤں میں حسن ان بے باک اور خوب صورت آنکھوں میں سے جھانکتا ہے۔ جو ایک اشارے میں یہ کہتی ہیں۔ کہ ہم سے محبت کرنے کا حوصلہ ہے تو آؤ۔ لیکن اس بارگاہ میں وہ مردود جنس لے کر نہ جاتا جسے شہری اپنی زبان

ہیں محبت کہتے ہیں۔ نہیں تو انہیں حسین آنکھوں میں شعلوں اور زہر سے ملی ہوئی کسی چیز کی چمک دیکھو گے۔ وہاں پوڈر نہیں، غازہ نہیں، حنا نہیں، صرف ایک چیز ہے اور وہ صحت ہے،

وہ ڈرپوک محبت نہیں جو چکوں کے پیچھے بیٹھ کر کبھی کبھی ایک حنائی ہاتھ نکال کر دکھاتی ہے۔ جو پیغام و سلام کے ابتدائی مرحلوں کی دشوار گذار راہ سے گذرتے گذرتے مرجاتی ہے، نہیں وہ محبت نہیں۔ یہ وہ محبت ہے جو ہیر کے نازک جسم میں ہو تو اُسے شیر کا دل دیتی ہے۔

چلتے چلتے شاید نادانستہ میں نے سرِراہ ایک پلّے کی دم پہ پاؤں رکھ دیا۔ وہ زور سے چیخا اور ماں غضب آلود شیرنی کی طرح میری طرف جھپٹی ——— بے ضرورت چھ سات بچوں کی ماں، نحیف جسم، سکڑی ہوئی کھال ——— گڑھوں میں دھنسی ہوئی۔ بے رونق آنکھیں ——— لیکن اس کمزور پیکر میں بھی حیات کا نہ بجھنے والا شرار پوشیدہ ہے۔ جو فطرت کے اہم فرض کو پورا کر رہا ہے افزائشِ نسل ——— سوچتا ہوں۔ کہ فطرت ایک قانون بنا کر پھر کس بے رحمی سے اسکی تعمیل و پیروی کرتی ہے۔ بقائے حیات ضروری تھی۔ لیکن ایک ایک کُتیا کے دس دس بارہ بارہ بچے پیدا ہونے کیا ضروری ہیں۔ یہ نحیف و نزار جسم جو حلوائیوں

کی دکانوں اور قصابوں کے چھچھڑوں پر پرورش پاتا ہے لگاتار اپنی زندگی سے قطع نظر
بچوں کی زندگی کے شعلے کو روشن رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے
اور پھر اپنی کمزوری اور ناطاقتی کے احساس اور انسان کے غضب اور قہر سے آشنا
ہونے کے باوجود کس بے باکی سے مجھ پر حملہ اور ہوتا ہے۔ ان خیالات میں غلطاں
بھاٹی دروازے کے باہر پہنچ گیا۔ اب رات زیادہ آچکی تھی۔ آمدورفت بالکل کم ہو
چکی تھی۔ کوئی اکا دکا آدمی نظر آتا تھا۔ سڑک کے ایک کنارے ایک تانگہ کھڑا تھا
میں اِسکے پاس سے گذرا۔ ایک عورت شاید اسے لڑکی کہنا زیادہ موزون ہوگا کیونکہ
اسکی عمر ۱۷، ۱۸ سال سے زیادہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ تانگے میں بیٹھی تھی۔ مجھے پاس سے
گذرتے دیکھ کر اس نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا ——— میری
طرف سے ذرا جرأت دلانے کی دیر تھی۔ اس کے سُرخ، خونین سرخ ہونٹ تبسم
کے لئے کانپ رہے تھے۔ لیکن میرے انداز سے شاید اسے معلوم ہوا کہ میں نہ مسکراؤنگا
کیونکہ یکبارگی وہ نیم وا ہونٹ بند ہو گئے ——— وہ ابھی تک میری طرف دیکھ رہی
تھی ——— یوں تو اسکے چہرے کا ہر حصہ نظر فریب تھا۔ لیکن مجھے اسکی جس چیز
نے مسحور کیا وہ اسکی آنکھیں تھیں۔ بھوری، سیاہی مائل، پلکیں گنجان، اور
نظریں اتنی تیز گویا میری روح کی گہرائیوں میں سے کوئی راز ٹٹول کر نکالنا چاہتی

ہیں۔ وہ آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں۔

بڑے پاکباز ہو نہ تم! اور میں بڑی ذلیل ہوں! ہے نہ! تم مسکراتے ہو تو شاید یہ اعترافِ شکست ہوتا ——— تمہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ باہمی مسکراہٹ سے تمہارا جسم میرے جسم سے یا تمہارا خیال میرے خیال سے چھو جائے ——— اچھا جاؤ ——— جن عورتوں کا پیشہ حسن فروشی نہیں۔ ان کی حسن فروشی اور سیہ کاری سے تمہارے غرورِ نفس کو تسکین ہوتی ہے ——— اونچے ایوانوں میں عالیشاں مکانوں میں، ریشمی اور زرتار پردوں کے پیچھے جو کچھ ہوتا ہے وہ عفو کر دینے کے قابل ہے۔ بیاہتا عورتوں کے نازک و معطر جسم (جوان کے شوہروں کی لگاتار محنت سے معطر کئے گئے ہیں) عاشقوں کی آغوش میں ہوں تو وہ جائز ہے! ان افسانہائے محبت کو تم ایک سکڑے ہوئے طنزیہ سے تبسم کے ساتھ سن سکتے ہو ——— لیکن ان کے خلاف آواز نہیں اُٹھا سکتے ——— کیونکہ انہیں معطر جسموں میں ایک نازک و گلابی جسم تمہارے لئے بھی ہے ———؟"

شاید اس قلیل وقفے میں جب میری آنکھیں اس نوعمر تجربہ کار لڑکی سے چار ہوئیں۔ اس کی آنکھوں سے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ اس نے یہ سب کچھ سوچا ہے۔ اور کسی طرح اس نے اپنے خیالات مجھ تک پہنچا

دیئے ہیں۔ دیر تک چلتے چلتے اسکی آنکھیں میری آنکھوں کے سامنے آتی رہیں۔
اور وہ سب کچھ کہتی رہیں۔ جو میں نے لکھا ہے۔

سینما میں ایک شام

سنا کوئی پنجاب کی داستان
کہ دل پر ہے بار تمنا گراں

وطن ہے مرا حسن کی سرزمین
کمی اس جگہ دلبروں کی نہیں

یہاں خنجر ناز ہے خوں فشاں
یہاں خاک کا رنگ ہے ارغواں

یہاں روز بہتا ہی دریائے خوں
یہاں موت سے کھیلتا ہے جنوں

یہاں سوز میں ساز پانی میں آگ
یہاں جاگ میں لگیا ہی بہاگ

"ساقی نامہ"

سینما میں ایک شام

ہدایات ۔شام کے ۶ بجے کا وقت ہے۔ سردیوں کے دن ہیں۔ پردہ اُٹھنے پر ایک سینما ہال کی نشست گاہیں ظاہر ہوتی ہیں۔ پردے کے قریب فرسٹ کلاس اور سکنڈ کلاس کی کچھ سیٹیں نظر آتی ہیں۔ درمیانی قطار کے سرے پر دو خوبرو لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ دونو اٹھارہ سال سے کم عمر کی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک نیلے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ہے، رنگ کھلتا ہوا سانولا۔ نقش تیکھے۔ آنکھیں شوخ۔ دوسری بالکل سفید لباس میں ہے۔ متین اور باوقار۔ رنگ گورا۔ نقش معمولی۔ لیکن آنکھوں میں ایک چمک سی ہے جس سے چہرے کی سادگی میں بھی حسن سا معلوم ہوتا ہے۔ تماشہ شروع ہونے میں ابھی آدھ گھنٹہ کا وقفہ ہے

سفید لباس والی ۔ تم مجھے یونہی کھینچ کے لے آئیں امتیاز۔ ہندوستانی تصویروں میں ہوگا وہی جو ہوتا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو دیکھ کر غش کر جائیں گے ——————"

۔۔ پٹی ساڑھی والی۔ (بات کاٹ کر) اور تمہیں ہنسی آجائے گی۔
کیوں شمیم ؟
شمیم۔ "نہیں ڈائریکٹروں کی عقل پر رونا آئیگا"
امتیاز۔ تو طاہرہ کے گانے کا بھی لطف آئے گا یا نہیں ؟
شمیم۔ جی ہاں طاہرہ بھی گائیں گی۔ سیدھی بھیرویں گا۔ تے۔۔۔ دانتوں پسینہ آئے گا۔"
امتیاز (ہنس کر) تو کیا اس سے مالکونس کا ترانہ سن کر تماشائیوں کو بھگا دینا چاہتی ہو ؟
شمیم۔ ٹھیک ۔۔ ہے بدذوقی تماشائیوں کی ہے میں کہتی ہوں۔ یہ لوگ کرنے کیا آتے ہیں۔
امتیاز۔ ہر ایکٹریس میں ایک ہونے والی محبوبہ کا خواب دیکھنے
شمیم۔ (چونک کر) خواب دیکھنے ؟
امتیاز۔ کنکھیوں سے شمیم کی طرف دیکھتی ہے۔ شمیم کے چہرے پر متانت زیادہ گہری نظر آتی ہے ساتھ ہی یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا کچھ کھوئی سی گئی ہے۔ کچھ عرصہ امتیاز شمیم کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر زیر لب گنگناتی ہے

میری آنکھوں میں کبھی جلوے تھے ان کے حسن کے
میری آنکھوں نے کبھی دیکھا تھا اِک خوابِ نشاط

شمیم (مسکرا کر) یہ کیا گنگنا رہی ہو؟

امتیاز۔ خواب دیکھ رہی ہوں ——— لو اب کھل جاؤ۔ بوقتِ مے پرستی ایک دن ——— ورنہ ہم چھیڑیں گے۔

شمیم۔ رکھ کر عذرِ مستی ایک دن (ہنس کر) ہماری منگنی ہو گئی جی۔

امتیاز۔ تو پھر خواب کی تعبیر ٹھیک نہیں نکلی۔

شمیم۔ یہی تو مزے کی بات ہے۔ کچھ پتہ نہیں۔

امتیاز (اشتیاق سے) بجھارتیں نہ بجھاؤ۔ آتا پتہ بتاؤ۔

شمیم۔ مجھے تو طلسمات کا سا رنگ معلوم ہوتا ہے۔ میرے چچازاد بھائی کی شادی پر تم آئی تھیں نا۔ اس موقع پر ہمارے خالو جو بیس سال سے کلکتہ رہتے ہیں آئے تھے۔ خالہ کو سلام کیا خالو سے ملی۔ خالہ زاد بھائی بہنوں کے نام سُنے اور لیجئے، انہیں میں سے ایک کے ساتھ منگنی ہو گئی۔

امتیاز۔ واہ واہ۔ اچھا خاصہ رومان بن گیا۔

شمیم۔ جی ہاں رومان بن گیا۔ انہیں دیکھا نہ سنا۔ میں کہتی ہوں ہیں پڑھا لکھا

کرنا دیدہ خاوندوں کے حوالے کرنا ہوتا ہے تو ــــــــــــ

امتیاز۔ (بات کاٹ کر) یہ بتاؤ انہوں نے تمہیں دیکھا کہ نہیں وہ ہیں کون اور کیا کرتے ہیں؟

شمیم۔ ہاں انہوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ ہماری خالہ زاد بہن ہمارے پاس آئیں بھابی کہہ کے بلایا ...... اور جاتے جاتے سُنا گئیں، ہمارے اختر نے تمہیں بہت پسند کیا۔ بتایئے ہم اصطبل کی گھوڑیاں ہوئیں کہ نہیں۔ لو اب گنگناؤ۔

میری آنکھوں نے کبھی دیکھا تھا اک خواب نشاط

روشنیاں بجھ جاتی ہیں تماشہ شروع ہوتا ہے۔ ایک خوش پوش نوجوان جو پچھلی قطار میں بیٹھا تھا۔ شمیم سے مخاطب ہوتا ہے۔

خوش پوش نوجوان۔ معاف فرمائیے گا۔ اپنے سر کو آپ ذرا بائیں طرف رکھیں۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں اندازے سے کہہ سکتا ہوں۔ جو حصہ مجھے تصویر کا سیاہ نظر آتا ہے۔ وہاں آپ کا رخسار اور ناک ہونا چاہیئے۔

شمیم۔ جلدی سے دائیں طرف ہو جاتی ہے۔

شمیم (زیر لب امتیاز سے) کس قدر گستاخ

امتیاز۔ لیکن آواز کس قدر سریلی ہے۔

شمیم - چلو ہٹو تمہارا جمالیاتی نقطہ نظر اور تم -

امتیاز - اچھا بحث بحثی ختم کرو - میں ہیروئین کا اظہار عشق غور سے سننا چاہتی ہوں ——————

خوش پوش نوجوان - معاف کیجئے گا - مجھے پھر آپ بولنے پہ مجبور کر رہی ہیں - آپ میرے اور تصویر کے درمیان پھر حائل ہو گئی ہیں - آپ کے بالوں کی خوشبو مشام جان کے لئے راحت ہی سہی - لیکن نہ اس قدر کہ میں تصویر سے محروم کر دیا جاؤں -

شمیم - (بھڑک کر) آپ کیلئے پولیس کو بلانا پڑیگا - شرم نہیں آتی آپ کو -

خوش پوش نوجوان - پولیس کو بلا کر آپ کیا کرینگی - یہی نا کہ قانون سے عدم واقفیت کا ثبوت دینگی

ادھر ادھر سے چپ رہو، چپ رہو کی آوازیں بلند ہوتی ہیں - چار آنے والے درجے میں سے "لیٹ ادے - لیٹ ادے" کے نعروں کی آواز سنائی دیتی ہے خوش پوش نوجوان چپ ہو جاتا ہے -

کچھ عرصہ کے بعد انٹرول ہوتا ہے - شمیم کنکھیوں سے اور امتیاز دیدہ دلیری سے خوش پوش نوجوان کی طرف دیکھتی ہیں - ہنستا ہوا کھلنڈرا چہرہ - موٹی موٹی آنکھیں چھریرا بدن - چہرے پر خفیف سے چیچک کے داغ، لباس میں وہ خوش ذوقی جو صدیوں

کی خاندانی امارت اور اعلےٰ درجہ کی تعلیم کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

امتیاز۔ (شمیم کے کان میں) "کہیں پولیس کے حوالے نہ کر دینا غریب کو اچھے گھر کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔"

شمیم (اسی آواز میں) "تو اچھے گھر کے لڑکے بالوں کی خوشبو گنایا کرتے ہیں"؟

امتیاز۔ اچھا بھئی کر دو پولیس کے حوالے۔ (خوش پوش نوجوان آگے جھک کر اور شمیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے) "معاف فرمائیے آپ خفا ہو گئیں میرا مقصد تو یہ نہ تھا۔ میں پھر نہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں" (پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد) لیکن میں کہے دیتا ہوں اتنی معافیاں نہ منگوایئے"

شمیم۔ حیرت سے نوجوان کی نوجوان کی طرف دیکھتی ہے۔ نوجوان ہنستا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔

امتیاز۔ لو اب کرو پولیس کے حوالے

شمیم۔ کچھ کھوئی ہوئی سی ہے۔ گویا کچھ سن نہیں رہی۔

امتیاز۔ "سنو تو تم نے یہ نہ بتایا تمہارے منگیتر کا نام کیا ہے اور کرتے کیا ہیں"؟

شمیم۔ (بد دلی سے) "نام ہے ان کا اختر حسین اور کرتے ہیں ڈاکٹری" تماشہ پھر شروع ہوتا ہے۔ ختم ہونے کے بعد دونو باہر نکلتی ہیں۔ دروازے کے پاس دو نوجوان کھڑے

باتیں کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہی ہے۔ جس سے شمیم کی جھڑپ ہو چکی ہے شمیم دونوں کو یکجا دیکھ کر چونکتی ہے۔ جھڑپ والا نوجوان ان دونو لڑکیوں کو دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنستا ہے اور چلا جاتا ہے۔

شمیم (دوسرے نوجوان کے پاس پہنچ کر) "آپ بھی تماشہ دیکھنے آئے تھے بھائی جان"

نوجوان:- "ہاں آؤ چلیں"

شمیم اور امتیاز سر جھکا کر چل رہی ہیں۔ امتیاز شمیم کو بار بار ٹھوکے دیتی ہے شمیم بہت ضبط کرتی ہے۔ لیکن رہ نہیں سکتی آخر پوچھتی ہے۔

شمیم:- "یہ آپ کے ساتھ کون تھا بھائی جان؟"

امتیاز ہمہ تن اشتیاق ہے شمیم ہمہ تن شرم۔

شمیم کا بھائی:- "تم نہیں جانتیں"

(ہنستا ہے)

شمیم:- (چڑ کر) "بتائیے نا"

شمیم کا بھائی:- "یہ ہمارے خالہ زاد بھائی اختر حسین تھے"

شمیم۔ کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے۔ امتیاز گنگناتی ہے۔

میری آنکھوں نے دیکھا تھا اک خواب نشاط

شمیم کے بھائی کو ہنسی کا دورہ پڑتا ہے۔ (پردہ گرتا ہے)

جوانی کی پہلی محبت

جوانی کی پہلی محبّت

سلیم نے قاہرہ کے سربفلک میناروں کی طرف دیکھ کر جو چاند کے نور میں دُھل کر تاباں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

پھر اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:" اُن دِنوں میں جوان تھا۔ اور وہ آرزوئیں جو جوانی اپنے ہمراہ لاتی ہے مجھ پر مسلّط تھیں۔ میں شہرت کے آسمان پر مہر و ماہ کی طرح روشن ہونا چاہتا تھا۔ مصر میں آکر مجھے خیال پیدا ہوا کہ میں صحرائے اعظم کی سیّاحی کروں۔ اور اس کے رموز کو دنیا پر منکشف کر دوں۔ آہ صحرا ہزاروں تشنہ کام مسافروں کے خون سے رنگین صحرا۔ اُٹھتے۔ بیٹھتے۔ سوتے۔ جاگتے مجھے صحرا کی سیاحی کا خیال رہتا تھا حتےٰ کہ صحرا کا شوق میرے لئے خوابِ حیات بن گیا۔

یہ آرزو بہار کے ایک شگفتہ موسم میں مجھے صحرا میں بہت دور تک لیگئی ایک دن پورا ضائع کرنے کے بعد آغازِ شب کے وقت میں عربوں کے ایک خیمے کے قریب پہنچا۔ دن بھر سورج کی بے پناہ حدّت سے تپتی ہوئی ریت کو طے کرنے

کے بعد اور ایسے آسمان کے نیچے گزرنے کے بعد جس میں دوزخ کی تمام گرمیاں منعکس تھیں۔ عرب بدّوؤں کے یہ خیمے خلدِ نعیم معلوم ہوتے تھے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بدّو اپنی مہمان نوازی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں شیخ قبیلہ ہر مسافر کے آرام کا انتظام اپنا فرض سمجھتا ہے مسافر بلا تکلف جتنا عرصہ چاہیں۔ اُن کے ہاں ٹھہر سکتے ہیں اور اس مہمان نوازی کا صلہ دینے کی کوشش کرنا گویا تمام قبیلے کی بے عزّتی کرنا ہے۔ شیخ قبیلہ کے خیمے کے آگے ایک نیزہ ریت میں گاڑ دیا جاتا ہے۔ جس سے یہ مراد ہوتی ہے۔ کہ جو شخص مہمان پر ہاتھ اُٹھانے کا ارادہ کریگا۔ اُسے پہلے شیخ قبیلہ سے نپٹنا پڑیگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ بدّوؤں کے قیام کے قریب اپنا خیمہ نصب کرنا ہتکِ عزت تصوّر کیا جاتا ہے۔

مَیں ان باتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کیونکہ خانہ بدوشی کی زندگی خود مجھے محبوب تھی۔ اور اس لئے میں نہایت بیباکی سے۔ غصیلے اور ہٹیلے بدّوؤں کے گروہ سے گزر کر شیخ سید محمدؐ کے پاس جا پہنچا اور جھک کر سلام کیا۔ وہ مجھے بھائی بھائی کرتا ہوا اندر لے گیا۔

ایک خیمہ میرے لئے وقف کر دیا گیا۔ اور بہت جلد میرے آرام کے بندوبست کی تکمیل ہو گئی۔

شاید تم شام مصر سے واقف ہو۔ ابھی ابھی آسمان ایک ایسی تصویر کی طرح خوبصورت اور درخشاں ہوتا ہے۔ جس میں اُن تمام رنگوں کی آمیزش ہو۔ جو کوئی چابک دست مصور اپنی ذہنی قوت سے اختراع کر سکتا ہے۔ اور دوسرے لمحے میں آسمان گہرے قرمزی رنگ کا ایک مخملی نقاب اوڑھ لیتا ہے۔ ستارے اس طرح نمودار ہوتے ہیں۔ گویا نفیس ترین ململ میں سے جواہرات روشن ہوں۔

پھر رات:۔ تاریک مخملی رات۔ تم نے قاہرہ میں ایسی ہزاروں راتیں دیکھی ہونگی لیکن صحرا میں یہی رات کئی درجے زیادہ خوبصورت۔

کئی درجے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ اور انسان کی روح سے زبان خاموشی میں گفتگو کرتی ہے۔ آہ شام ہائے صحرا! کچھ اس طرح کی رات تھی۔ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ بدوؤں کا سادہ کھانا کھا کر۔ میں بدوؤں کا آب حیات لذیذ ترین قہوہ پی رہا تھا اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں سے وادی دیکھ رہا تھا جہاں صحرا کا ریتلا فرش سیاہ رنگ میں تبدیل ہو کر افق کی سُرخی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے اُسے سب سے پہلے دیکھا۔

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ ضرور ہے۔ کہ اُس بدو نے جو خیام کے قریب پہرے پر کھڑا تھا۔ اُسے نہیں دیکھا۔ میں اُس کا حلیہ کیسے کھینچ سکتا ہوں جس وقت وہ چاندنی کی روشنی میں میری طرف لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آ رہا تھا۔ تو میں نے محسوس

کیا کہ میں نے اُس کی تمثیل آجتک نہیں دیکھی۔ اب مجھے معلوم ہوگیا ہے۔ کہ میرے خوف اور تعجب کا باعث کیا تھا۔ اُس میں کچھ ایسی بات تھی جو نفرت اور خوف کی محرّک ہوتی ہے۔ اُس کے لمبے سفید بال شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے۔ اور اُس کی زرد خوفناک آنکھوں کو سایہ کئے ہوئے تھے

وہ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ وہ اس طرح قدم اُٹھا رہا تھا۔ گویا بہت کمزور اور نحیف ہو۔

پھر یوں محسوس ہوا گویا خیموں کا ہر ایک کُتّا اُس کے آنے سے خبردار ہو گیا ہو خیموں کی تاریکی میں سے کُتّوں کی سایہ نما صورتیں بھونکتی ہوئی نکلیں۔ میں نے اپنی تمام عمر میں ایسا واقعہ کبھی نہیں دیکھا۔ زرد اور سیاہ کُتّوں کے ہجوم میں خیموں کے دروازے پر بوڑھا ایک خوفناک چیخ مار کر گر پڑا۔ میں ایک ڈنڈا لیکر چشمک برق کی تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ اب اہر طرف سے مدد پہنچ رہی تھی۔ لیکن سب سے پہلے میں نے چیخم دھاڑ مچا کر کُتّوں پر بے امتیاز برسانی شروع کیں۔ تھوڑے عرصے میں میدان صاف ہوگیا۔ نیچے جھک کر میں نے بوڑھے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے نیم وا آنکھیں کئے ہوئے زبانِ حال سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اس کے حلق سے کچھ ناقابلِ فہم الفاظ نکلے۔ اور ہاتھوں سے اس نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُس کے حلق

میں پانی ٹپکایا۔ لیکن مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ بدوؤں کا گروہ جو میرے اردگرد پر اجمائے کھڑا ہوا تھا۔ تحیر خیز طور پر خاموش تھا۔ اور جب بیچارہ بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔ تو تمام بدوؤں کے مُنہ سے ایک اجنبی سا لفظ نکلا۔ جو باوجود عربی دان ہونے کے میں سمجھ نہ سکا۔ ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہوا کہ بدو مجھ سے اور بوڑھے سے دور دور ہی رہتے ہیں۔

اب انبوہ کو چیر کر شیخ سید محمد آگے بڑھے۔ اور بوڑھے سے پوچھنے لگے۔ "آیا وہ رات اس کے خیمے میں بسر کرے گا"۔ بوڑھے نے سر ہلایا۔ اور کچھ کھانا طلب کیا۔ بہت جلد اس کو کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھانے کو ایک کپڑے میں باندھ لیا۔ پانی کا برتن دوسرے ہاتھ میں پکڑا مجھے سلام کیا۔ اور بدوؤں کی طرف بغیر دیکھے بھالے صحرا کی طرف چل دیا۔

کُتّے پھر بھونکنے لگے بدو کھڑے بوڑھے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور اس وقت تک دیکھتے رہے۔ جبتک وہ افق کی تاریکی میں غائب نہ ہو گیا۔ سید محمدؐ نے باوقار اور پر شکوہ الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا۔ کہ مَیں نے انکے قبیلے کو بیعزت ہونے سے بچا لیا تھا۔ ورنہ تمام عمر ان کے دامن پر یہ بدنما داغ رہتا۔ کہ وہ ایک بوڑھے کی مدد نہ کر سکے تھے۔

دوستو! اگر تم نے اس بدّو سردار کو دیکھا ہوتا۔ جو کسی فرانسیسی خاندانی امیر کی طرح یا لکھنؤ کے کسی بانکے کی طرح مہذب، شیریں کی طرح بیباک اور عورت کی طرح رحمدل تھا۔ تو تمہیں محسوس ہوتا کہ اس شکریے نے مجھ پر کس طرح اثر کیا تھا دو کُتے بوڑھے کے تعاقب میں چلے گئے تھے۔ کیونکہ دور سے ان کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ پھر یکبارگی گیدڑوں کے ایک عظیم گروہ کے چیخنے کی آواز آئی۔ اور کتوں کی آوازیں ان میں ڈوب گئیں۔ چیخیں اس زور و شور سے بلند ہو رہی تھیں۔ گویا بادل گرج رہے ہوں۔ اب وہ چیخیں بھی بند ہو گئیں۔ لیکن کتے واپس نہیں آئے۔

اس عجیب واقعے کی وجہ سے کچھ پریشان سا ہو کر میں لیٹ گیا۔ سونے کے لئے نہیں۔ بلکہ غور کرنے کے لئے آخر نیند آئی۔ لیکن کس پریشانی کے بعد تمام رات مجھے زرد چشم بوڑھوں۔ بھونکتے ہوئے کتوں اور چیختے ہوئے گیدڑوں کے خواب آتی رہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کتنا عرصہ سوتا رہا۔ لیکن جس وقت میں اُٹھا۔ تو صبح کی سنہری نازک اُنگلیاں ریت کے بلند ٹیلوں کو مس کر رہی تھیں۔ خیمہ مدھم سی روشنی سے لبریز تھا۔ اور کوئی شخص باہر سرگوشیوں میں مجھے بلا رہا تھا۔ میں فوراً اُٹھ بیٹھا تپنچہ ہاتھ میں لیا، دروازے کی طرف بڑھا۔ اور باہر دیکھا۔ کل والا بوڑھا مجھے اشارے سے بلا رہا ہے۔ دوستو! ان دنوں میں جوان تھا۔ اور تم جانتے ہو کہ جوانی ان دنوں بے

پرواہوتی ہے۔ میں نے جلدی سے کوٹ پہنا۔ اور بوڑھے کے پیچھے ہولیا۔ اس نے مجھے اشاروں سے سمجھایا۔ کہ وہ مجھے خیام سے دور لے جاکر کوئی ضروری بات کہنا چاہتا ہے۔ آخری خیمے سے سو گز کے فاصلے پر بوڑھا رُک گیا۔ اور پہلے اس نے خیموں کیطرف اشارہ کیا۔ پھر میری طرف اشارہ کیا۔ اور پھر اس راستے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سے کارواں گزر کر مصر کی طرف جاتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا یا تو وہ گونگا ہے۔ اور یا اُس نے خاموش رہنے کی قسم کھائی ہے میں نے پوچھا "کیا تمہارا مطلب ہے۔ کہ میں خیموں کو چھوڑ کر چلا جاؤں"۔

اُس نے اپنا سر ہلایا اور اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔

میں نے پھر پوچھا "اسی وقت"۔

اُس نے پھر اپنا سر ہلایا

"کیوں"

اُس نے مجھے اشاروں سے سمجھایا کہ خیموں میں رہنے میں میرے لئے موت کا اندیشہ تھا۔ اور مجھے غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے بدوؤں کو چھوڑ کر چلا جانا چاہیئے۔

میں اس کی مجنونانہ سنجیدگی کا ایک کرشمہ بھی الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر

ہوں۔ لیکن افسوس جوانی پختہ کار بڑھاپے کے مشوروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ میں نے اپنا سر انکار کے انداز سے ہلایا اور اُس سے رخصت ہوا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اس کی زرد آنکھوں میں افسوس کی جھلک دیکھی۔ جو بعد میں مجھے کئی دفعہ یاد آتی رہی اس ملاقات کے بعد مجھے نیند نہیں آتی۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں آفتاب بلند پہاڑیوں کے پیچھے سے بلند ہوا۔ دوستو تم لُو سے واقف ہو۔ لیکن وسطِ صحرا کی سموم سے واقف نہیں۔ اُس صبح سموم کا ایک طوفان آیا۔ ایک ریت کی دیوار اس قدر بلند کہ اُس نے سورج کی روشنی کو چھپا لیا۔ اس قدر تاریک کہ اُس نے دن کو رات بنا دیا۔ اسقدر گہری گویا میں اُس میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ توبہ۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ سموم جنات کا ایک لشکر تھا۔ جو اپنی رسیلی اُنگلیوں سے میرے گلے کو دبا کر میری جان نکال لینا چاہتا ہے میں نے سوچا۔ وہ یہی آفت تھی جس کے متعلق مجھے اس بوڑھے نے مجھے خبردار کیا ہے۔ اگر میں صبح ہی خیموں سے چل پڑا ہوتا تو اس وقت تک میں کسی گاؤں میں اطمینان سے قہوہ پی رہا ہوتا۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کہ اُس واقعات کے مقابلے میں جو مجھے پیش آنے والے تھے۔ سموم کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ طوفان گزر گیا اور ہر ایک شخص نے خدائے قدوس کی درگاہ میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور اُس کی رحمت کاملہ نے ہر ایک کو صحیح و سالم رکھا۔ اُس پریشانی اور بد انتظامی کے دوران میں جب

جب خیموں کو دوبارہ درست کیا جا رہا تھا۔ میں نے سکینہ کو پہلی بار دیکھا۔

وہ سید محمدؐ کے خیمے سے ایک مختصر سا غالیچہ جھاڑنے کے لئے باہر نکلی تھی۔ غالیچے کو جھاڑتے وقت سورج کی روشنی اُس کی چوڑیوں پر اُس کے گندھے ہوئے بالوں پر اُس کے لباس پر۔ اُس کے چاندی کی پازیبوں پر۔ اُس کے خوبصورت پاؤں پر رقصاں تھی۔ میں چپ چاپ اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر روشنی اُس کی آنکھوں کی سیاہ گہرائیوں پر رقصاں ہوئی اور میں نے اپنے آپ کو دو نہایت خوبصورت سیاہ آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اُس کے رخسار تمتما اُٹھے۔ اُس نے جلدی سے اپنے لبادے کو درست کیا اور خیمے کی طرف بھاگ گئی۔ دو ستو اُس نے میری طرف صرف ایک نگاہ کی تھی۔ لیکن اُس ایک نگاہ میں کیوپڈ نے اپنا تیر چلا دیا تھا۔ یاد رہے میں جوان تھا اور جوانی بے پرواہ ہوتی ہے۔

میں بیمار بن گیا اور یہ ظاہر کیا کہ سموم نے مجھ پر بہت بُرا اثر کیا۔ میرے کمینے دل نے سکینہ کے والد سید محمدؐ کی مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ وہ مہمان نوازی جو شبہ سے ناآشنا ہے۔ اور صرف زر کے خوف سے بے نیاز۔ میں اپنے بستر پر پڑا رہتا۔ اور دو خوبصورت سیاہ آنکھوں کے خواب دیکھتا۔ یا رات کو جب گیدڑوں کے چیخنے کی آواز آتی تو مجھے اُس بوڑھے کا خیال آتا جس کے متعلق مجھے

شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ ساحر ہے۔ دوستو تم ہنستے ہو۔ بیشک قاہرہ کے سب سے پُر رونق بازار میں ایک محفوظ مکان کے برآمدے میں بیٹھ کر مذاق کرنا آسان ہے لیکن ذرا سنتے رہو۔

(۲)

پندرہ دن گزر گئے۔ سردار سید محمد کے گھر کی عورتیں نقاب اوڑھ کر اور اپنے آپ کو مناسب و موزوں لباس میں چھپا کر میری تیمارداری کیا کرتیں۔ لیکن سکینہ نہ آئی۔ یہ سب کچھ تھا۔ مگر مجھے مایوسی نہ تھی۔ دوستو تم جانتے ہو میں جوان تھا۔ اور جوانی بے پرواہ ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا۔ کہ اس ذلیل فریب دہی سے پھر مجھے شرم آنے لگی تھی۔ آخر ایک دن وہ شوربے کا ایک پیالہ لئے ہوئے میرے خیمے میں داخل ہوئی اور ڈوبنے والے آفتاب کی آخری کرنوں نے اُس کے لباس کے باوجود بھی اُس کے پریزاد جسم کے نازک تناسب کو نمایاں کر دیا۔ میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ دل کی دھڑکن مجھے کہ طوفانِ سموم میں اپنی سخت جانی کی وجہ سے بچ رہا تھا مار ڈالے گی۔ دوستو! جوانی میں محبت کے شعلے چمکتی ہوئی۔ آنکھوں کی ایک نگاہ سے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ عرب کی وہ دوشیزہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ اور شوربے کا پیالہ زمین پر رکھ دیا۔ میری مشتاق نگاہوں نے باریک نقاب

میں سے دیکھا کہ اُس نے اپنی آنکھیں میری طرف سے پھرا رکھی ہیں۔ آہ وہ حسین آنکھیں جن پر سیاہ پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اور میرے دل نے یا شاید میرے غرور نے بتایا۔ کہ وہ مجھے نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ وہ اُٹھنے لگی۔ اور مَیں نے انتہائی۔ جرأت سے کام لے کر اُس کے ہاتھوں کو مس کیا۔ وہ چونک اُٹھی۔ میری طرف ایک نظر دیکھا۔ اور غزالِ رعنا کی طرح طرارے بھرتی ہوئی چلی گئی۔ وہ گئی۔ اور میری روح کو ساتھ لے گئی۔ میں اپنے بستر پہ لیٹا ہوا اُس ایک نگاہ کا لطف لیتا رہا۔ میرے ارادے؟

دوستو! میں جوان تھا اور جوانی ارادوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ خاصکر جب چمکتی ہوئی آنکھوں کا تعلق ہو۔

خیمے ایک چشمے کے قریب نصب کئے گئے تھے جو کھجوروں کے ایک جھنڈ کے قریب نشیب میں واقع تھا۔ یہاں غروبِ آفتاب کے وقت خیموں کی بانقاب پُراسرار اور وقار آفریں مصری عورتیں گھڑے اُٹھائے ہوئے پانی بھرنے آیا کرتیں۔ میں بہت جلد محبت نے دانائی اور مصلحت اندیشی کو خیرباد کہہ دیا۔ اور میں ہر روز ہوا خوری کی خاطر چشمے کی طرف نکل جایا کرتا۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ سکینہ سب سے بعد پانی بھرنے آیا کرتی تھی۔ میں نے اُسے اپنا نام سکھایا۔ جب وہ اپنی موسیقی نواز

آواز میں "سلیم" کہتی اور اسکا عطر افشاں سانس مجھے اپنے رخساروں پر گرم محسوس ہوتا تو مجھے خیال ہونے لگتا تھا۔ کہ شاید مجھے کوئی پری دنیا سے اُٹھا کر کوہ قاف کی پُر فضا سیر گاہوں میں لے گئی ہے۔ دو ہفتوں کے اندر اندر میرے انتظامات مکمل ہو گئے۔ میں نے سید محمدؐ کے گھوڑے کو اپنی طرف راغب کر لیا تھا۔ اور اُسے اچھی طرح سدھا لیا تھا۔ آخر ایک رات میں گھوڑے پر سوار ہو کر چشمے کے قریب جا پہنچا۔ تھوڑے عرصے میں وعدہ کی پکی، محبت کی دیوانی سکینہ میرے پاس آ پہنچی۔

جب صبح ہوئی تو ہم ابھی اُس مقام سے بہت دور تھے۔ جہاں ہمیں چھپنے کے لئے کوئی جگہ مل سکتی تھی۔ میں صحرا سے اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن اس سنسان اور ویران مقام کو دیکھ کر جہاں ہم پہنچے تھے میری روح لرز اُٹھی۔ کئی جگہ ریتلے ٹیلوں کے قریب پتھر کی چھوٹی چھوٹی دیواریں تھی۔ جو دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور جن میں کہیں کہیں مختصر سے شگاف بنے ہوئے تھے میرا خیال ہے۔ کہ وہ پرانے زمانے کی قبریں تھیں۔ چاروں طرف ریت ہی ریت تھی۔ اور سبزے اور نمی کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔ اُس مقام پر حسرت اس طرح برس رہی تھی۔ گویا شاہانِ سلف اُسجگہ مدفون ہوں۔

آہ۔ خاکِ مصر۔ خاک خوشبوئے مصر اس صحرا میں کسقدر خوفناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ سکینہ نے اعتماد کے ایک عجیب انداز میں میری گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کی طاقت کم ہو رہی تھی۔ آرام کرنا اشد ضروری تھا ابھی تک ہمارے تعاقب میں کوئی شخص نہ آیا تھا۔ میں نے سکینہ کو ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ اور اُسے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس دیا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا۔ کہ ہمارے پاس پانی کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے۔ اور ہمیں جلد کسی جائے پناہ تک پہنچنا چاہیئے۔ ہمارے پاس صرف معمولی روٹی اور کھجوریں تھیں لیکن جب بوسوں کی شیرینی موجود ہو۔ تو اس سے بہتر غذا اور کیا ہو سکتی ہے۔

آہ وہ جوانی کی پہلی محبت۔

دوستو۔ کبھی کبھی تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس شخص نے کوئی گناہ نہیں کیا وہ کبھی مسرور بھی نہیں ہوتا۔ ذرا تصور کرو ——— اگر کر سکتے ہو ——— ہم ایک سنسان مقام میں بیٹھے ہیں۔ جو ہمارے لئے نعمائے بہشت سے زیادہ لذیز ہے۔

تھوڑا عرصہ ہم اس طرح بیٹھے رہے۔ ایک ہذیان مسرت سے مخمور اور پھر ایک آواز سنائی دی۔

یاد رہے میں نے کسی شخص کی آواز نہیں کہا۔ صرف ایک آواز سنائی دی۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے۔ کہ میں سکینہ کی نازک باہوں کو اپنے گلے سے جدا کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اب بھی میں اس لمحے کا خیال کرتا ہوں۔ تو میرا دل کانپ جاتا ہے

ایک بت کی طرح بے حس وہ بوڑھا جسے میں جادوگر سمجھتا تھا۔ کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ خدا جانے میں کتنا عرصہ اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن جب میں نے مُڑ کر سکینہ کی طرف دیکھا تو وہ خاک پر مرجھائے ہوئے پھول کی طرح گری ہوئی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے رو رہی تھی اور کانپ رہی تھی کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

بوڑھا کودتا ہوا نیچے کی طرف آیا۔ اور میں نے انتہائی خوف سے دیکھا۔ کہ کبھی کبھی وہ اپنے ہاتھوں کے بل بھی چلتا تھا۔ اس بڑھاپے کے باوجود اس پھرتی سے آیا۔ گویا پہاڑی بکرا ہو۔

دوستو! تم جادوئے مصر کے قائل نہیں ہو۔ اچھا سنو۔ اس بوڑھے نے نیچے اتر کر میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ جس طرح ایک کُتا مار کھا کر اپنے مالک کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے تمام بدن پر رعشہ طاری

ہو گیا۔ اور مجھ پر جنونِ غم کی ایک ایسی کیفیت طاری تھی۔ کہ اس وقت میں خوفناک سے خوفناک موت کے لئے تیار تھا۔ لیکن اس بوڑھے سے آنکھیں ملانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے افق کی طرف اشارہ کیا جہاں تین چار سوار میری طرف آتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں سکینہ کے قریب گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ عشق کا جن سر سے اُتر گیا۔ اور موت کا تاریک سایہ میری روح پر محیط ہو گیا۔ میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ میں اپنی محبت کی خوفناک زنجیروں میں جکڑ کر سکینہ کو موت کے منہ میں کشاں کشاں لے آیا تھا۔

پھر وہ بوڑھا جس کی تمام عادات انسانوں سے مختلف تھیں اشارے کرنے لگا۔ دوستو! میں تمہیں کس طرح اس کے اشاروں کی حالت سمجھا دوں۔ آہ وہ اشارے سکینہ خوف کے مارے مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ اور اسکی آنکھوں میں تکلیف کا ایک ایسا سیلاب موجزن تھا۔ کہ اس وقت بھی خیال کر کے میں رو پڑتا ہوں۔

بہنے دو۔ ان آنسوؤں کو بہنے دو۔ یہ مردانگی کے خلاف نہیں ہے۔ خیر میں پھر افسانے کی طرف آتا ہوں۔ اسی اثنا میں وہ تین چار سوار جو میں نے افق کی طرف دیکھے تھے۔ قریب ہوتے جا رہے تھے۔ قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ابھی تک وہ بوڑھا میرے شانے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے کچھ اشارے کر رہا تھا۔ اور آخر کار خطرے کی نزدیکی نے

مجھے اپنی حالت کے ورد ناک احساس پر مجبور کیا۔ اور اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے اِن ریتلے ٹیلوں اور پتھروں میں جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ جن کے متعلق میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ اب قریب آنے والے سواروں میں میں سید محمد کو صاف پہچان سکتا تھا۔ وہ بوڑھا اب مجھے پوری قوت سے کھینچ رہا تھا۔ اور مجھے ان سوراخوں کی طرف لیجانا چاہتا تھا۔ جو پتھروں میں نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھیں جنونیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور اس کی باتوں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مجھ سے درخواست کر رہا ہے۔ التجا کر رہا ہے۔ کہ مَیں اندر چلا چلوں۔ میں نے سکینہ کی گردن میں اپنے ہاتھ ڈالے۔ اور کہا "چلو سکینہ یہ شخص ہمیں چھپا سکتا ہے۔"

اس نے سہم کر جواب دیا "نہیں نہیں مجھے خوف آتا ہے"!

میں نے اسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور بوڑھے کو رہبری کا اشارہ کرتے ہوئے لڑکھڑاتا ہوا۔ اُس کے پیچھے پیچھے چلا راستہ کافی لمبا تھا اگر بوڑھا میری مدد نہ کرتا۔ تو میں یقیناً مر گیا ہوتا۔ پتھروں پہ سکینہ کے بوجھ کی وجہ سے میرا پاؤں بار بار پھسل پھسل جاتا تھا۔ سکینہ کا خوف لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا حتےٰ کہ وہ خوف سے دیوانی ہو گئی۔ لیکن میں نے اسے زور سے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ سوراخ کے منہ کے قریب پہنچکر سکینہ نے ایک چیخ ماری۔ اور مافوق الفطرت طاقت سے کام لے کر میری گود سے جدا ہو کر بوڑھے

سے پرے بھاگی۔

اس نے روتے ہوئے کہا "وہاں نہیں۔ وہاں نہیں۔ یہ بوڑھا مجھے کھا جائیگا"۔

اور عین اس وقت سیّد محمدؐ نے جو ہمارے قریب آچکا تھا۔ بندوق اُٹھائی اور فیر کیا۔ اس واقعے کو سالہا سال گزر چکے تھے۔ لیکن یہ واقعہ میرے ذہن میں اسی طرح نقش ہے۔ گویا کل گزرا ہے۔ بوڑھے نے ایک خوفناک چیخ ماری۔

جس وقت سید محمدؐ نے گولی چلانے کیلئے بندوق اُٹھائی تھی۔ اس وقت تقدیر اس کی اُنگلیوں کے ذریعے اپنا خوفناک کام پورا کرنا چاہتی تھی۔

ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ ——— ہلکی سی بے شک لیکن ایسی جس میں تکلیف کی ایک دنیا لرز رہی تھی ——— سکینہ میرے قدموں کے قریب گر پڑی۔ اور اس کے پہلو سے خون کی ایک دھار جس میں میری جوانی برباد ہو کر رہ گئی۔ نکل کر تپتے ہوئے پتھروں کو رنگین کرنے لگی۔

(۳)

جو شخص ایسے وقت میں اپنے جذبات کو بیان کرنے کی کوشش کرے۔ میرے دوستو! اس کا کبھی یقین نہ کرنا۔ وہ جھوٹا ہے۔ مفتری ہے۔ کاذب ہے۔ لیکن عاشق نہیں۔ دنیا میری نگاہوں میں اندھیر ہو گئی۔ اور میرے حواس مختل ہو گئے۔ مجھے سوائے سکینہ کے اور

کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آہ اس کی آنکھوں میں ابھی تک محبت مرتعش تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے قریب گرا دیا۔ اور جب اس نے میری چھاتی پر سر رکھ کر اپنا آخری عطر آلود سانس لیا۔ تو مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ میری جوانی کی پہلی محبت اب اندوہِ حیات بن گئی۔ میرے لئے اب صبح کی مسکراہٹ اور شام کی خاموشی بے معنی چیزیں ہونگی۔

بوڑھے نے کتے کی سی وفاداری سے مجھے پھر سوراخ کے اندر گھسیٹنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اسے اپنے آپ سے پرے پھینک دیا۔ اس شخص نے مجھے کھینچ کر غار کے اندر لے جانا چاہا۔ کیونکہ سید محمدؐ اب بالکل قریب آچکا تھا۔ اور اس کے رفقاء میری طرف بندوقوں کی نالیں کئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مجھے اتنا یاد ہے۔ کہ میرے دل میں اتنا خیال پیدا ہوا۔ کہ شاید بوڑھا ڈر کے مارے بھاگ گیا ہے۔ لیکن نہیں میں غلطی پر تھا۔

دوستو تم جادوئے مصر پر یقین نہیں کرتے۔ اچھا سنو۔

میرے کانوں میں ایک چیخ کی آواز آئی۔ اور اس چیخ میں کچھ ایسی بات پنہاں تھی۔ کہ میں کانپ اُٹھا۔ میں نے اپنا سر پھرا کر دیکھا اور غار میں سے پتھروں میں سے ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سے گیدڑوں کا ایک عظیم الشان گروہ چیختا اور چلاتا ہوا نکلا۔ اور پیشتر اسکے کہ سید محمدؐ یا اس کے رفیق مجھے کچھ نقصان پہنچائیں۔ گیدڑ جھپٹ کر ان پر جا پڑے تم جانتے ہو۔ گیدڑ آدمی سے کس طرح گھبراتے ہیں۔ آدمی سے کس طرح بھاگتے ہیں پھر جادوئے

مصر پر یقین کرنے سے انکار کرتے ہو۔ سید محمدؐ اور اس کے رفقاء بھاگے۔ دم دبا کر بھاگے پھر ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ اور گیدڑ واپس جانا شروع ہوئے۔ اس کے بعد میں بیہوش ہوگیا۔ جب ہوش میں آیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا وہ جادوگر۔ وہ گیدڑوں کا سردار جس نے مجھے اس مہربانی کے عوض میں جو میں نے اس کی جان کتوں سے بچانے میں ظاہر کی تھی میری اتنی مدد کی تھی۔ ایک گہری خندق کھود کر غائب ہو چکا تھا۔ سورج اپنی پوری حدت اور تیزی سے چمک رہا تھا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے سکینہ کو قبر میں اتارا۔ اس کی لحد پر کوئی نشان نہیں ہے۔ لیکن دوستو! کیا یہ کم ہے۔ کہ میں اپنی جوانی اسکی قبر پر چھوڑ آیا ہوں۔

(۴)

سالہا سال گزر گئے۔ اور آخر ایک دن پھر میں سکینہ کی قبر پر دو آنسو بہانے کیلئے گزرا۔ اس کی قبر کے قریب پہنچنے سے پیشتر میں نے گدھوں کا ایک عظیم اجتماع دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی شخص حال ہی میں مرا ہے۔ ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھ کر نیچے نظر ڈالی۔ اس کے بعد میں نے گھوڑے کو واپس موڑا۔ ایڑ لگائی اور سرپٹ دوڑایا۔

دوستو! میں نے کیا دیکھا۔ چاندنی میں کھجور کے درختوں کے سائے ریت پر پڑ رہے تھے اور ہزاروں گیدڑوں کا ایک گروہ حلقہ جمائے بیٹھا تھا۔ انکے درمیان ان کے سردار بوڑھے کی لاش پڑی تھی۔ اور وہ بیٹھے تھے۔ کہ گدھ اسکی لاش کو کھانے نہ پائیں۔ ہاں وہی گیدڑ جو گدھوں

کے ساتھ ملکر ہمیشہ مردہ انسان کو کھا جایا کرتے ہیں۔"

سائے بلند ہو رہے تھے شام پڑنے والی تھی ہم تمام اُٹھے اور سلیم سے رخصت چاہی۔ اب گھر واپس جاکر خدا جانے مجھے بھی کتنا عرصہ زرد چشم بوڑھوں۔ بھونکتے ہوئے کتوں اور چیختے ہوئے گیدڑوں کے خواب آتے رہیں گے ٭

عشرت باقی

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عشرتِ باقی

نواب صلابت یار خاں پنج ہزاری نے خود ان نفیس جواہرات سے مزیّن شمع دانوں کو جو کمرے کی وسعت میں صرف ایک محدود دائرہ نور پیدا کر رہے تھے۔ اپنے قریب کے تخت پوش پر رکھ لیا آج وہ خلافِ معمول دار المطالعہ میں آکر بھی افسردگی کے اس مبہم احساس کو جو اسے اپنے دل پر صبح سے طاری ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔ کم نہ کر سکا تھا۔ دار المطالعہ کے چاروں طرف بلند و وسیع الماریوں میں مجلد کتابوں کی ہزارہا جلدیں جنکی صوفیانہ ابریق اسکی سلیم الطبعی کی دلیل تھی۔ نفاست سے چُنی ہوئی تھیں۔ محراب دار دروازوں اور کھڑکیوں پر جو مغلیہ صنعت تعمیر کی خصوصیات امتیازی ہیں۔ زرد وزی اور ریشمی گراں بار پردے خوبصورت کنول اور جھاڑ کاشانی مخمل کا فرش، ہر طرف دولت کی فراوانی اس ہجوم نقش و نگار کی ہر شے سے نمایاں تھی۔

وہ مخملی گدیلوں کا سہارا لیتے ہوئے وہ تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ شمع کی زرد لطیف روشنی

اس کے زرد مگر نزاکت آلود چہرے کو اور بھی جلا دے رہی تھی۔ وہ اپنی عمر کا بہترین حصہ طے کر چکا تھا۔ اس کے سفید بال، روشن، بڑی بڑی آنکھیں سفید داڑھی جسکو جھریوں نے تقدیس عمر کا رنگ دیدیا تھا۔ یہ تمام چیزیں ایسی تھیں۔ کہ بیک نظر دیکھنے سے یہ شبہ ہوتا تھا۔ گویا کسی صناع مصور کے موقلم نے تقدیس اور تجربے کی روح کو مادی لباس پہنا دیا ہو وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد اُس کی طبیعت اکتا گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور ہوا کی فرحت کے ساتھ ہی اسے اس ناقابل بیان خوشبو کا احساس ہوا۔ جو پرانی کتابوں کے اوراق سے پیدا ہوتی ہے۔ کتابیں۔ کتابیں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں۔ آج وہ اس جگ بیتی کو چھوڑ کر اپنی کتاب حیات میں سے آپ بیتی کے کئی واقعات کا خیال کر رہا تھا۔ انہیں پڑھ رہا تھا۔ کیونکہ اب اس کیلئے ہر ایک چیز پڑھی جاتی تھی۔ پڑھنا۔ اسکی زندگی کا مقصد رہا تھا۔ بچپن سے لیکر جوانی تک اور جوانی سے لیکر ادھیڑ عمر تک وہ پڑھتا رہا تھا۔ وہ ایک پنج ہزاری امیر تھا۔ لیکن یہ خطاب اسے گویا ورثے میں ملا تھا۔ اور اس کی اپنی دلیری اور بہادری اس خطاب سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی اسے یاد تھا۔ کہ ابتدا ہی سے وہ کسی فقرے کی بے ساختہ تراش کو دیکھ کر یا کسی خیال کو مناسب الفاظ کے طلسم میں قید دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ تڑپ جایا کرتا تھا۔ اس کے ہم عمر اسکا مذاق اڑاتے تھے وہ زرق برق کپڑے پہنے ہوئے ہتھیار سجائے اونچی بنے شعلہ مزاج گھوڑوں پر سوار اسکے

سامنے سے گزرتے تھے۔ تو اس کے دل میں انہی کی طرح بن جانے کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ کوئی خیال نہ آتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ اور تفاخر کے انداز میں اپنی مونچھوں کو بل دے کر عشق و محبت کی داستانیں بیان کرنے لگتے تھے۔ ان داستانوں میں ان کا اپنا ذکر ہوتا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے۔ اس کے مطالعہ میں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ یہ اپنے وقت سے کئی سو سال بعد پیدا ہونے والا انسان عشق اور محبت جنگ اور جدال کی پر فریب فضا سے دور کوسوں دور جی رہا تھا۔ کتابوں کے ان مسائل سے جو حیات و ممات، مسرت و غم اور اسی طرح کے نازک رشتوں کی گتھیاں سلجھاتے تھے وہ مانوس تھا۔ یوں مانوس تھا۔ گویا وہ بھی انہی کتابوں کا ایک صفحہ ہے۔ دن بھر اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھ کر فطرت کے معموں کو سلجھتے ہوئے دیکھنا اسے عشق و محبت کی الجھنوں سے زیادہ مرغوب تھا۔ اس تمام تسلسل میں صرف ایک واقعہ تھا۔ جو اسکی زندگی میں، پر سکون زندگی میں خلل انداز ہوا تھا۔ آہ۔ وہ واقعہ لیکن اب تو اس واقعہ کو گزرے کئی سال ہو چکے تھے وہ اسے تقریباً فراموش کر چکا تھا۔ پھر آج کیا وجہ تھی۔ کہ اس کے خیالات حافظے کے شفاف پردوں پر سوار ہو کر اسی سرزمین میں جا پہنچے تھے۔ جس کا ایک فرزند چند لمحوں کے لئے اسے مضطرب کر گیا تھا۔ محبت کی سرزمین جسکی معمولی سی باتیں اس کے لئے رازِ سربستہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کتنی دور تھی۔ پھر بھی آج وہ محسوس کرتا تھا۔ گویا وہ خود اس سرزمین میں

پیدا ہوا ہے۔ شاید اس لئے کہ آج کی رات عین اسی رات کے مشابہ تھی۔ جب ایک مجنونِ عشق ستارے کی طرح اس کی ظلمتِ دل پر چمکتا ہوا نکل گیا تھا۔ وہ بہت آہستہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور ایک کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا نہایت سکون سے اس نے بھاری بھاری پردوں کو ایک طرف ہٹا کر کھڑکی کھولی۔ سرد ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی داخل ہوئی۔ مینہ کے بڑے بڑے موٹے قطرے بوچھاڑ کے ہمراہ اندر آنے لگے۔ کمرے کا سکون یکایک مختلف آوازوں سے گونجنے لگا۔ باہر اولے پڑ رہے تھے۔ لیکن اسے کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ سفید بال بکھر کر ماتھے پر آ پڑے تھے۔ وہ دلجمعی سے عناصر کی اس کشمکش کو دیکھ رہا تھا۔ اس طرح دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ کوئی تماشائی ہو۔ اور اس کے سامنے کوئی دلچسپ تماشا دکھایا جا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں اب تاریکی سے مانوس ہو کر درختوں کی طویل ہیئت کا امتیاز کر سکتی تھیں۔ یکایک بجلی چمکی۔ اور لمحے کے لئے درخت سڑک اور سامنے کا کھلا میدان گویا سرخی آمیز چاندنی میں دھو گئے گئے۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا۔ کہ اسی طرح ایک رات اس کی دل کی ظلمتوں پر کئی نئے جذبات کی بجلیاں چمکی تھیں یکایک اُس نے کان لگا کر سُننا شروع کیا۔ دور بہت دور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی۔ آوازوں کے اس ہجوم میں بھی اس کا تمیز کرنا مشکل نہ تھا۔ پہلے پہل اُس نے سمجھا۔ کہ شاید اس کے کان بج رہے ہیں۔ شائد وہ اس رات

کے واقعات میں اسقدر محو تھا۔ کہ اسے وہی واقعات پیش آنے کی توقع تھی۔ لیکن آواز نزدیک تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اب اسے کوئی شبہ نہ رہا۔ کہ یہ آواز اس کے واہمے کی تخلیق نہیں حقیقت ہے۔ اب اس نے بہت ہی نزدیک ایک گھوڑے اور سوار کی مبہم سی ہیئتیں دیکھیں۔ بجلی پھر چمکی اور اُس نے "دقفہ نور" میں دیکھا۔ کہ گھوڑا بیدم ہو کر گر پڑا سوار خون میں لت پت تھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ سوار کی عمر یا کسی اور بات کا اندازہ کرے۔ تاریکی مسلط ہو چکی تھی۔ شاید وہ ایک ثانیہ کھڑا رہا۔ یا شاید ایک عمر کھڑا رہا۔ لیکن اب اس کے لئے وقت کا تعین ناممکن تھا۔ اسی حالت میں یکایک کھڑکی کے پٹ تھا مکر سوار اوپر چڑھ آیا۔ خدا جانے کس طرح۔ کیا معلوم وہ کونسا مافوق الفطرت جذبہ تھا۔ جسکی مدد سے وہ دیوار پر چڑھ سکا۔ سوار صلابت یار جنگ کو دیکھ کر ذرا نہیں ہچکچایا۔

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "میں زخمی ہوں۔ کیا آپ مجھے دو تین گھنٹے کے لئے آرام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں"۔

وہ حقیقت میں زخمی تھا۔ انتہا کا زخمی۔ اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ کپڑوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ بال خون سے چپک گئے تھے۔

یار جنگ نے بغیر کچھ جواب دیئے اپنے ضعیف بازوں کے سہارے سے جن میں انسانی ہمدردی کی قوت موجزن تھی۔ اسے اندر آنے میں مدد دی۔ اور نہایت سکون سے کہا

"خوش آمدید۔ آپ یہاں ہر طرح سے محفوظ ہیں"

وہ اسے سہارا دیئے ہوئے ایک پلنگ کی طرف لیکر بڑھا۔

(۲)

نووارد نے کہا "میرا نام معزالدین ہے۔ اور میں ——— کے صوبیدار کا لڑکا ہوں۔ مجھے معاف کیجئے گا"

اور یہ کہہ کر وہ تکان کے مارے پلنگ پر گر پڑا۔

"مجھے صلابت یار جنگ کہتے ہیں"

یہ کہتے ہوئے اُس نے کھڑکی بند کی، اور قریب کی ایک الماری سے مشک بو مفرح شربت کا ایک گلاس بھر کر معزالدین کے لبوں کے ساتھ لگا دیا۔ وہ تکان کی اس انتہا گہرائی تک پہنچ چکا تھا۔ جب گرد و پیش کی ہر ایک چیز دھندلی سی نظر آتی ہے۔ اور تعجب خیز سے تعجب خیز واقعہ معمولی حادثات کا جزو معلوم ہوتا ہے۔ وہ شربت کے گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں خالی کر گیا۔ اسے اپنے بدن میں گرمی اور توانائی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوئی اب اس نے احساس کیا۔ کہ اس کی ظاہری حالت بوسیدہ کپڑوں، خاک و خون میں لتھڑے ہوئے بدن اور صلابت یار جنگ کی حالت میں کیسا نمایاں تفاوت ہے صلابت یار جنگ ایک پدرانہ شفقت سے اس پر جھکا ہوا۔ اس کے زخموں کا معائنہ کر رہا تھا۔ معزالدین دل ہی

دل میں اس کشادہ پیشانی میزبان کی فراخدلی پر غور کر رہا تھا۔ اس نے کس بیباکی سے معزالدین کو اندر بُلا لیا تھا۔ ممکن تھا کہ معزالدین کوئی چور ہوتا۔ کوئی قاتل ہوتا۔ جو سپاہیوں کی حراست سے بھاگ نکلا ہو۔ اس نے ان تمام خیالات سے بے نیاز ہو کر معزالدین کو خوش آمدید کہا تھا۔ معزالدین کا دل اس شرافتِ نفس و ایثار سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اس عرصے میں صلابت یار جنگ زخموں کے معائنے سے فارغ ہو چکا تھا

اس نے اطمینان افزا لہجے میں کہا "زخم بہت ہیں۔ مگر گہرا کوئی بھی نہیں۔ تم نام خدا ابھی جوان ہو۔ انشاء اللہ ہفتے بھر میں مکمل صحت ہو جائیگی۔"

معزالدین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "خلاف توقع میرا اس رات کے وقت بغیر دروازہ کھٹکھٹائے کھڑکی کی راہ سے کود آنا اور آپ کے مطالعہ میں مخل ہونا یقیناً آپ کو بہت ناگوار ہوگا۔ لیکن مَیں سچ کہتا ہوں۔ کہ مجھے کوسوں تک کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ جہاں میں رات بھر کے لئے ٹھہر سکتا۔ اور دشمن برابر میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ کہ دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ کیونکہ اس وقت نوکر تمام سوئے ہونگے۔ اور دروازے کی آواز میرے کمرے تک نہیں پہنچتی۔"

نواب معزالدین کے پاس بیٹھ گیا۔

معز الدین نے ایک ایسے لہجے میں جس میں شکریے پر ندامت کا رنگ زیادہ غالب تھا۔ کہا۔ "ممکن ہے میں کوئی ڈاکو ہوتا۔ یا قاتل ہوتا۔"

صلابت یار جنگ مسکرایا۔

"تمہارا آنا بے مثال نہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ تیس سال ہوئے گزر چکا ہے۔ عین اسی وقت ایک رات تمہاری عمر کا ایک نوجوان شخص بالکل تمہاری سی حالت میں اس کھڑکی کی راہ سے اندر آیا تھا۔ اپنی عمر کے اس خوشگوار حصے میں بھی میں مطالعۂ کتب میں مصروف تھا۔ وہ مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتا رہا۔ لیکن اس کی باتیں ایسی چیزوں کے متعلق تھیں۔ جنہیں میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اُس نے حسن اور عشق ——— عشق اور حسن کے متعلق لاکھوں باتیں کیں۔ وہ باتیں خواب کی طرح یاد ہیں۔ اور بعض وقت میرا تخیل ان کو قوس قزح کے رنگین مجموعے کی طرح دلچسپ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے۔ گویا میں نے اپنی تمام عمر کتابوں کی بے حس فلسفیانہ زندگی کی قربانگاہ پر نذر کر دی ہے۔ دنیا اس شخص کے انجام کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ دنیا سمجھتی ہے۔ کہ وہ کامرانِ محبت تھا۔ لیکن میں بہتر جانتا ہوں۔ شروع میں اسے محبوب کی ملاقات میسّر تھی۔ لیکن صرف ایک سال کے بعد دربار کے سازشی اُمراء نے اسے مروا ڈالا۔ اور لوگ یہ سمجھتے رہے۔ کہ وہ اپنی محبوبہ کو لیکر کسی اور ملک میں جا رہا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی آخری

رات اسی کمرے میں گزار کر گیا تھا۔ دوسرے دن اسکی لاش کے ٹکڑے اڑا دیے گئے۔
وہ باز بہادر تھا"[1] معز الدین چونک پڑا۔ اس کا متخیل روپ متی اور باز بہادر کے تمام واقعات کو اس کے سامنے پیش کر رہی تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا وہ خود اس واقعہ میں شریک تھا۔ وہ اس وقت کا تصور کر رہا تھا۔ جب روپ متی اور باز بہادر اپنے وطن کو خیر باد کہنے پر تیار ہو کر کسی اندھیری رات کی پردہ دار آغوش میں چھپ کر دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ باز بہادر کا انجام ایسا خوفناک ہوا۔۔ روپ متی اور اس کی محبت کا غوغا ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکا تھا۔ مگر کسی شخص کو اس حسرتناک فسانے کے آخری باب کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ آخر کار اس نے کہا۔
"مجھے افسوس ہے۔ کہ باز بہادر کی طرح میں محبت کے تیروں سے گھائل ہو کر یہاں نہیں آیا۔"

"باز بہادر بھی تمہاری طرح خاموش الطبع تھا۔ اس نے بھی مجھے اپنے افسانے کا ایک جزوی حصہ سنایا۔ وہ تمہاری طرح یہاں زخمی بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے زخم اور اس کی نگن

---

[1] باز بہادر اور روپ متی کا واقعہ عہد مغلیہ کے ارمان بھرے دور کی ایک مشہور یادگار ہے اور کئی مصور اس واقعے کو قرطاس پر منتقل کر چکے ہیں۔

خوبصورتی کے ان نشانات کو نہ مٹا سکے تھے۔ جو اس کی ہر بات سے پیدا تھی۔ اس انداز ایسے جاذب نظر اور مہذب تھا کہ شکستہ حالی کے ہجوم میں بھی اس کی لطافت نہ چھپ سکتی تھی۔"

یہ کہکر نواب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر یکایک اس طرح گویا اسے اچانک کسی چیز کا خیال آیا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور مسکرا کر کہنے لگا "میں اپنی میزبانی کے فرائض بھول گیا تھا۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ اس وقت میرے خیال میں نوکروں کو جگانا تو آپ کے مفاد کے . . . . . ؟

"بیشک۔ بیشک انہیں کل بہت سا کام کرنا ہوگا" اور معز الدین بھی اپنے میزبان کی خوش طبعی اور ذہانت پر دلی اطمینان سے مسکرایا۔

صلابت یار جنگ نے شمع اُٹھالی۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ معز الدین اکیلا رہ گیا۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا اس کے علاوہ کمرے میں کوئی شخصیت موجود ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ پچھلے دونوں کی تکان، بے خوابی اور ذہنی کلفت اس احساس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق رکھتی تھی۔ لیکن ان دنوں لوگ نفسیات کے ماہر نہیں تھے اور وہ دماغ کی نیم شعوری کیفیات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ معز الدین کو یہ خیال ہو رہا تھا گویا باز بہادر اس کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھا ہوا اس کی طرف غمگین نگاہوں سے دیکھ رہا

تھا۔ وہ اسکی خوشنما سریلی آواز تقریباً سن سکتا تھا۔ یہ آواز بہت دور سے آرہی تھی۔ جس طرح کوئی شخص دریا کے کنارے کھڑا ہو کر دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے شخص سے باتیں کرے۔ معز الدین کو معلوم ہوتا تھا۔ گویا باز بہادر کی آواز کسی دریا کے پہنائے وسیع کو طے کر کے اس تک پہنچ رہی ہو۔

"تمہاری طرح ایک عورت کی محبت میں مجھے بھی لڑائیاں کرنا پڑی تھیں میں بھی زخمی ہو گیا تھا۔ انتہا کا زخمی۔ بلا کا زخمی۔ میں بھی اسی طرح اندھیری رات میں اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے پناہ گزین ہوا تھا۔"

معز الدین نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ گویا ابھی باز بہادر بنفسہ کسی پردے کے پیچھے سے نکلکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیگا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا۔ کیونکہ وہ ان خطرات کا کوئی تصور نہ کر سکتا تھا۔ جو اس کے واہمے نے اس کے دل میں پیدا کر دئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ کہ اس کا دماغ واقعات کے پے در پے ہجوم سے شل ہو گیا ہے۔ اور اسی لئے وہ سایوں سے بھی خوف کھاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کل صبح سورج کی روشنی میں یہ تاریک خیالات شبنم کے قطروں کی طرح جذب ہو جائینگے لیکن اس قسم کی تاویلوں سے اسے کوئی تسلی نہ ہوئی۔ باز بہادر اس کے دماغ میں اس کے جسم میں اس کی روح میں حلول کر گیا تھا۔ اور لمحہ بہ لمحہ باز بہادر کی آواز اس کے کانوں

میں بہت صاف طریقے سے گونج رہی تھی۔

صلابت یار جنگ نے دروازہ کھولا۔ اور شمع لیکر اندر داخل ہوا۔ اس ناکافی روشنی میں بھی معز الدین کی روح کی تاریکی کچھ کم ہونے لگی۔ نواب اپنے ساتھ سامان خورونوش لایا تھا چیزوں کو تخت پوش پر رکھتے ہوئے۔ اس نے کہا "تکلف کو کام میں نہ لائیے گا۔"

میں تکلف والا آدمی ہوتا۔ تو کھڑکی کی راہ سے اندر آتا؟"

اور وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

صلابت یار جنگ نے کہا۔

تمہیں غالباً تعجب ہوگا۔ کہ میں نے اس بیباکی سے تمہیں اندر آنے کی کیوں اجازت دیدی حقیقت یہ ہے۔ کہ میں نے تمہیں باز بہادر سمجھا۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ پھر اپنی کتابوں کی طرف ایک عجیب انداز سے دیکھ کر بولا۔

"باز بہادر۔ ہاں باز بہادر جو میرے عقیدے کے مطابق پھر ایک روحانی صورت میں آگیا ہو۔ کہولت۔ خمیدہ پشت۔ سفید مو۔ لرزہ براندام کہولت باز بہادر کے لئے خلق نہیں کی گئی۔ میرے لئے اس کا تصور اسی طرح روشن و شاداب ہے۔ جس طرح اس رات تھا۔ سچ پوچھو تو میں اس کے علاوہ باز بہادر کا اور کسی طرح تصور نہیں کر سکتا۔"

معزالدین سوچ رہا تھا۔ کہ وہ اسے اپنی رام کہانی کے کونسے حصّے سنائے اس کے لئے ابتدا سے لیکر انتہا تک ہر ایک شے دلچسپ تھی۔ مرغوب تھی۔ آخر اس نے اہم اور غمّاز حصّوں کو حذف کر کے اپنا قصّہ سنانے کا قصد کیا۔ اس نے کہا۔

"یہاں سے پچاس کوس پر ——— کا قلعہ ہے۔ قلعے دار کی لڑکی ——— سے مجھے محبت ہے۔ ہاں دیوانہ وار محبت ہے۔ اس نے میرے خلوص سے متاثر ہو کر مجھے ایک خط لکھا تھا۔ معصوم آرزوؤں سے لبریز، مخلص جذبات سے پُر۔ وہ ہوس کے معنی سے بھی ناآشنا ہے۔ قلعے دار اِن دنوں کہیں باہر تھا۔ قائم مقام کے ہاتھ کسی طرح وہ خط پڑ گیا۔ اس کی ابتذال آشنا طبیعت اس کے مفہوم کو کیا سمجھ سکتی تھی خط ایک عورت کی طرف سے تھا۔ اور عورت کی طرف سے ایسے خط ہمیشہ عاشقانہ ہوتے ہیں۔ اس خیال پر اعتقاد رکھتے ہوئے اس نے قلعے دار کو واقعہ کی اطلاع دی۔ ضروری تھا۔ کہ قلعے دار کے وہاں پیشتر پہنچنے سے پہلے میں اس خط کو اپنے قبضے میں لے آؤں۔ لیکن میرے ارادے کی بھنک دشمنوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی انہوں نے میرا تعاقب کیا۔ اور اب خدا جانے وہ کہاں بھٹک رہے ہونگے قریب ہی میرے والد کا قلعہ ہے۔ وہیں جا کر میں اپنے بندوبست کو مکمّل کرونگا۔"

صلابت یار جنگ معزالدین کے الفاظ کو اس بیتاب انہماک سے سُن

رہا تھا۔ گویا خود اس کی اپنی ہستی اپنی روح کے تار اس تمام واقعہ سے لرزاں ہیں۔

اس نے جوش سے بھری ہوئی آواز میں کہا "رگوں میں تازہ اور گرم خون کو محسوس کرنا کسی جذبے سے متاثر ہو کر مصیبت کے پہلو بہ پہلو راہ طے کرنا کیسا خوشگوار ہوگا"

اس نے قریب کی دیوار سے نہایت تیزی سے ایک تلوار اتار لی۔ اور اُسے بے نیام کر دیا۔ شمع کی روشنی میں اس کا دستہ اس طرح چمکنے لگا جس طرح رات کے وقت آسمان کی نیلگوں سطح پر کہکشاں نمودار ہوتی ہے۔

"میں ایک تیغ ہزاری ہوں۔ میرے پاس بھی ایک تلوار ہے۔ لیکن محض کھلونا۔ روز صبح کو میرے نوکر کمرے کو صاف کرتے وقت اس کو بھی حسبِ خواہش صاف کر دیتے ہیں۔ یہ کمرے کی زینت ہو سکتی ہے۔ طبیعت کیلئے خیال آفرین ہو سکتی ہے لیکن میرے کسی کام کی نہیں"

معز الدین نے جواب دیا "ایک اصیل گھوڑا اور ایک تابدار شمشیر میرے لئے یہ دونوں چیزیں سرمایۂ دو عالم ہیں"

صلابت یار جنگ نے ندامت سے لبریز آواز میں پوچھا "اور یہ سب کچھ تم نے ایک عورت کے لئے کیا"

"ہاں عورت۔ مگر آہ۔ کیسی عورت"

صلابت یار جنگ نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں پر جھکا لیا "عورت میرے لئے ایک عجیب پیچیدہ معما ہے۔ ان کے الفاظ، ان کی نگاہیں، ان کے خوبصورت متناسب خوش انداز و خوشنما بدن ان کے انداز کی لطافت اور لوچ وہ جذبات جو انہیں متاثر کرتے ہیں۔ وہ خیالات جو انکی زبان پر رواں ہوتے ہیں۔ مگر جنکو ان کی آنکھیں جادو طراز سرمگیں آنکھیں جھٹلاتی ہیں۔ یہ تمام اشیاء مجھے وہمی دنیا کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں مجھے ان آدمیوں پر کسقدر رشک آتا ہے۔ جو ان سے باتیں کرتے ہیں ہنستے ہیں۔ ان کو سمجھتے ہیں"

معز الدین نے کہا "کیا دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں۔ جو عورتوں کو سمجھتے ہیں"

"ہاں باز بہادر اور تم جیسے آدمی"

معز الدین چونک پڑا اس کے ذہن میں خود، باز بہادر کا خیال آرہا تھا۔ صلابت یار جنگ بھی اپنے خیالات میں محو تھا۔ وہ خواب جیسے مبہم اور خوشگوار جذبات میں غرق تھا۔ ان جذبات میں جو تنہائی کی لمبی راتوں اور کتابوں کی دائمی صحبت نے اس کے دل میں ایک آتشیں رو کی طرح بھر کا دیئے تھے۔ یکایک اس نے گویا

چونک کر کہا" باز بہادر صرف ایک گھنٹہ میرے پاس بیٹھا رہا۔ اُس نے مجھے اپنا افسانہ سنایا۔ میری تمام عمر کا مجموعہ اس قلیل وقت کی برابری نہیں کر سکتا۔

اس کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کی زندگی کا ایک لمحہ بہشت ہے۔ اور دوسرا دوزخ۔ ایک لمحے میں اسے اپنی محبوبہ کی دفا سرشتی پر اعتماد کامل تھا۔ دم بھر میں اِس کا خیال بدل جاتا۔ ایک لمحے میں اسے یہ خیال آتا کہ ایک عورت جیسی مقدس تخلیق کا اس کی طرف نوازش کی نگاہوں سے دیکھنا دنیا بھر کی مسرت کا حاصل تھا۔ دوسرے لمحے میں اسے خیال آتا کہ وہ انسان کسقدر بیوقوف ہے۔ جو عورت کی سرشت پر اعتماد رکھ کر اپنی مسرت کو تباہ کرنے کا باعث ہو۔ اس نے مجھ پر ایک ایسی رنگین اور شفاف دنیا کے دروازے کھول دئے۔ جس کے ان طلسمی محلوں کو میں نے صرف ایک گھنٹے کے لئے حسن اور عشق کی عالمگیر روشنی میں جگمگ جگمگ کرتے ہوئے دیکھا۔ جہاں آرزو کی شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ جہاں کامرانی کے دئے جل رہے تھے۔

آج مجھے یہ شبہ پیدا ہو رہا ہے۔ کہ میرے اس وسیع مطالعے کی تمام مسرت جذبات کی حقیقی عشرت کے سامنے کوئی پایہ نہیں رکھتی۔ جذبات۔ آہ جذبات معرز الدین میں نے اس لفظ کے معنی سن رکھے ہیں۔ صرف سن ہی رکھے ہیں۔

لیکن اب تمہیں جانے کی جلدی ہو گی۔"

اس نے شمع اُٹھائی۔

معزالدین نے کہا "میرا خیال ہے۔ کہ ابھی مجھے اور زیر بار احسان ہونا ہے میری تلوار راہ میں گر گئی۔"

صلابت یار جنگ نے اپنی تلوار معزالدین کے ہاتھ میں دیدی۔

"میں نے اسے کھلونا کہا تھا۔ لیکن تمہارے مضبوط ہاتھوں یہ کھلونا نہیں رہے گی۔"

معزالدین نے پھر کہا "سرمایۂ دو عالم میں سے میں ایک چیز پا گیا۔ دوسری باقی ہے۔"

"ایک اصیل گھوڑا کیوں ہے نا؟"

"آپ نے درست اندازہ کیا ہے۔"

صلابت یار جنگ نے شمع اُٹھا کر معزالدین کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اصطبل میں جا پہنچے۔ معزالدین نے خود ایک گھوڑے پر زین کسی۔ اور چلنے کے لئے تیار ہوا۔

صلابت یار جنگ نے مسکرا کر کہا "خدا حافظ اب ہمارے راستے جدا ہیں

اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ کل رات اپنی کتابوں میں غرق میں انہی کو عشرت باقی تصوّر کرونگا۔ اور آج کی باتوں کو ایک بوڑھے شخص کی سٹھیائی ہوئی باتوں سے تعبیر کرونگا لیکن اس وقت میرا جی یہی چاہتا ہے کہ میں اپنی کتابوں کو دیا سلائی دکھادوں۔ اور تمہارے ساتھ چل نکلوں۔ اس طرح کہ ایک تلوار زیبِ کمر ہو۔ ایک اصیل گھوڑے پر سوار ہوں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر میں بھی تمہاری فتح کو اپنی فتح اور تمہاری شکست کو اپنی شکست سمجھوں۔"

معزالدین بہت متاثر ہوا۔

آخر کار اس نے کہا" آپ میرے ساتھ چلئے اور جو کچھ آپ نے کہا ہے۔ کر کے دکھائیے۔ آپ میرے جذبات کو اپنے جذبات تصوّر کیجئے۔ اور دیکھئے۔ کہ کتابِ حیات کے یہ افسانے ارباب نظر کے لئے مطالعہ سے بھی زیادہ دانش آموز ہوتے ہیں"۔

صلابت یار جنگ بغیر کچھ کہے سنے اندر سے ایک تلوار اُٹھا لایا۔ اس نے زرہ پہنی۔ سر پر خود رکھا۔ خود اپنے گھوڑے کو سامان سے آراستہ کیا۔ اور بولا" مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا بیس سال ہمیشہ کے لئے میری گذشتہ عمر سے نکال دیئے گئے ہوں"۔

معزالدین نے مسکرا کر جواب دیا" جذبات کی جوانی حیات کی جوانی ہے

وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر چل کھڑے ہوئے

(۳)

وہ پانی سے تربتر معزالدین کے قلعے میں جا پہنچے۔ معزالدین کے والد شکار کو گئے ہوئے تھے۔ رات باہر گزارنا پڑی۔ ان کی غیر موجودگی میں معزالدین کا حکم نادر شاہی سطوت رکھتا تھا۔ قلعے کے مہتمم اپنے آقا کو اس حالت میں دیکھ کر چنداں متعجب نہ ہوئے وہ اس کی شعلہ مزاجی سے بخوبی واقف تھے۔ معزالدین نے سستانے کے بغیر فوراً فوج کے سردار اعلےٰ کو طلب کیا۔ وہ اُدھیر عمر کا آدمی تھا۔ قوی ہیکل۔ مضبوط۔ چوڑے چکلے شانوں والا جسکے چہرے پر بجائے پختہ کاری کے جو اس کی عمر کی مقتضی تھی۔ خود سرانہ شجاعت اور ہٹ دھرمی کے نشان تھے۔

معزالدین نے کہا "قلعے میں کتنی فوج ہے"

"دس ہزار حضور"

"ہوں۔ میں اسے خود دیکھنا چاہتا ہوں"

سردارِ اعلےٰ عسکری پچھلے پاؤں لوٹ گیا۔ اور تھوڑے عرصے میں قرنا پھونکے جانے کی آواز سنائی دی۔ ہتھیاروں کی جھنکار۔ گھوڑوں کی ٹاپیں اور سپاہیوں کے قدموں کی چاپ ہوا میں گونجنے لگی۔ عسکری واپس آیا۔ اور کہا "چلئے"

وہ دونوں عسکری کے پیچھے ہو لئے۔ قلعے کے صحن میں فوج صفیں جمائے کھڑی تھی۔ افسروں کی ننگی تلواروں پر بجلی کی روشنی پڑتی۔ تو یوں معلوم ہوتا۔ گویا شفاف چمکیلے سانپ پھن اٹھائے کھڑے ہیں۔ مینہ اسی طرح زور شور سے برس رہا تھا۔ لیکن معزالدین سپاہیانہ انداز سے تمام صفوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے عسکری کے قریب واپس آ کر کہا ”ٹھیک ہے“

معزالدین کچھ عرصہ خاموش رہا۔ پھر کسی فوری جذبے سے متاثر ہو کر بولا
”عسکری“

”حضور“

”بھلا تم اس فوج سے کتنے آدمیوں کا مقابلہ کر سکتے ہو“

عسکری نے اس غیر متوقع سوال پر تعجب کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ سپاہی کے لئے افسر کے سوال قطعی احکام ہوتے ہیں۔ اس نے کہا ”حضور قلعے کی جائے وقوع مناسب نہیں۔ لیکن حزم و احتیاط سے اپنی فوج سے دگنی جمعیت کو آسانی سے پسپا کیا جا سکتا ہے“

”اور اگر دشمن کی جماعت اس سے زیادہ ہو۔ بہت زیادہ ہو“
”تو سپاہی جان دیکر اپنے آقا کا حقِ نمک ادا کر سکتے ہیں“

معزالدین نے احسانمندی کے جذبات سے لبریز ہوکر عسکری کا ہاتھ دبایا۔

"عسکری۔ واقعی آج تمہیں حقِ نمک ادا کرنا ہوگا۔ یاد رکھو آج کی رات کوئی فوج تمہارے قلعہ کے پاس سے گزر کر نہ جانے پائے۔"

"نہیں جانے پائیگی۔"

"اگر فوج کی تعداد تم سے بہت زیادہ ہو تو جس طرح تم مناسب سمجھنا عمل کرنا"

عسکری نے ایسے کامل اطمینان سے گویا وہ کسی معمولی مشورے پر عمل کرنے کی ہدایت لے رہا ہے۔ جواب دیا۔" اگر کسی فوج کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہوگی تو وہ اسی صورت میں یہاں سے گزرنے پائیگی۔ کہ ہمارے سپاہیوں کی لاشیں ان کے پاؤں کے نیچے روندی جارہی ہوں۔"

معزالدین نے مسکرا کر صلابت یار جنگ کی طرف دیکھا۔

"اور عسکری ایک بات تو کہنا میں تم سے بھول ہی گیا۔ بھلا اگر شہنشاہ خود اپنے حکم خاص سے میرے تعاقب میں فوج کو روانہ کرچکا ہو۔"

عسکری نے دلجمعی سے کہا۔" فوج کے کسی افسر کو شہنشاہ کے حکم محض اپنے سے اعلےٰ افسر کی وساطت سے پہنچ سکتے ہیں مجھے آپ کا حکم مل چکا ہے۔ یعنی آپکی وساطت سے شہنشاہ کا حکم مل چکا ہے۔"

اچھائیں ایک ہزار آدمیوں کا دستہ لے کر _____ کے قلعے کو مسمار کرنے جا رہا ہوں۔ نو ہزار آدمی تمہارے پاس رہینگے۔ وقت پر مجھے اطلاع کرنا۔ غالباً مفید ثابت ہو۔"

عسکری نے اپنے بہترین سپاہیانہ انداز میں سلام کیا۔

معزالدین نے مسکرا کے پھر صلابت یار جنگ کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔ "آج کی رات ہم باغی ہیں۔"

صلابت یار جنگ نے کہا۔ "لیکن کس کے لئے۔ کیا ہمارا مقصد ایسا پاکیزہ نہیں کہ اس کے لئے ایسی نام نہاد بغاوت کا خطرہ جھیل لیا جائے۔"

صبح کا وقت تھا۔ لیکن افق پر ابھی دو ایک تارے جھلملا رہے تھے۔ میدان میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ صبح کاذب کی مدھم روشنی میں وہ چہرے جن پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ انتہا سے زیادہ ڈراونے معلوم ہوتے تھے۔ صلابت یار جنگ اور معزالدین قلعے سے نکلے۔ معزالدین کی فوج میں سے صرف سو آدمی باقی تھے۔ معزالدین نو سو آدمی کھو کے بھی مسرور تھا۔ اس نے وہ خط حاصل کر لیا تھا جس کیلئے وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ وہ لاشوں سے گزرتے ہوئے ایک ٹیلے کے قریب جا پہنچے اس ٹیلے کے قریب نائب قلعہ دار نے اپنی جان انتہائی قیمت پر فروخت کی تھی۔ وہ

لڑنے والے آدمیوں کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ وہ دونوں ٹیلے سے ذرا دور کھڑے اس منظر کو حسرت آشنا نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہ قلعے کیطرف سے انہیں چند ایک زخم دار کہار ایک محافہ اُٹھائے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ اسی ٹیلے کے قریب آکر ٹھٹک گئے۔ کہاروں نے معزالدین اور اس کے ہمراہیوں کی طرف سر اُٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ موت بے رحم موت کی موجودگی میں تھے اس وقت تہذیب کے قواعد بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں۔ معزالدین اور صلابت یار جنگ اپنے گھوڑے پر سے اُتر پڑے۔ انہیں احساس ہو رہا تھا۔ کہ اس وقت انہیں اس زمین سے بلند ہونے کا کوئی حق نہیں۔ جس پر ایک شجاع آدمی ابدی نیند سو رہا ہو۔

معزالدین نے کہار سے صرف ایک سوال پوچھا۔ "نائب قلعہ دار کی بیوی؟"

کہار نے بھی اسی بے پروائی۔ سادگی اور اختصار سے جواب دیا۔ "ہاں"

معزالدین چپ چاپ پیچھے کی طرف مڑا اور اپنے گھوڑے کی باگ تھام کر اپنے قلعے کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔

لیکن صلابت یار جنگ بت بنا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک عورت کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے کس قدر عورتوں کے جذبات کو ملیامیٹ کرنا پڑتا ہے۔ معزالدین ایک رات کے لئے باغی ہو گیا تھا اس نے اپنی جان کو ہتھیلی

پر رکھ کر اپنی محبوبہ کو خوش کرنا چاہا۔ ایک عورت کو خوش کرنا چاہا۔ اور آہ۔ وہ کسقدر عورتوں کو ناخوش کرنے کا موجب بنا۔ کیا یہی وہ عشرت تھی۔ جس کو حاصل کرنے کیلئے باز بہادر نے اپنی جان دی تھی۔ اور معزالدین نو سو آدمیوں کی جانیں قربان کر چکا تھا۔ کیا یہی ان جذبات کا کمال تھا۔ جو دور سے اس قدر شفاف اور رنگین معلوم ہوتے تھے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ شاید وہ اسی لئے ان باتوں کی برداشت نہ کر سکا۔ مگر نہیں اس کی کتابوں کی زندگی مرنج مرنجاں زندگی ان تمام جذبوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ یہ عشرت فانی تھی۔ اور اس کے علاوہ دوسری عورتیں سحر طراز۔ جادو نگاہ۔ متناسب الاعضاء عورتوں کے عشرت کے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ عشرت باقی کے راز کو سمجھ گیا تھا۔

قسمت اور خطوطِ رنگین

میری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیرؔ باقی
انہیں مرنے ہی کا اب تک نہیں اعتبار ہوتا

قسمت اور خطوط رنگین

کلیم کا خط اپنے بہترین دوست نعیم کے نام۔

پیارے نعیم! چاروں طرف سمندر کی شورش افزا لہریں افق کی نیلگوں باریک لکیر کے قریب فضا میں تحلیل ہو ہو کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن جہاز کے قریب قریب انکی شورش ناقابل برداشت ثابت ہو رہی ہے۔ عین اسی طرح میرے دل کی گہرائیوں میں سکون موجود ہے۔ لیکن سطح پر اندوہ کے تاریک بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تم حیران ہو گے۔ کہ آخر میں نے روانگی کے وقت تمہیں کوئی اطلاع کیوں نہیں دی۔ اس کے لئے میں معافی کا خواستگار ہوں۔ میرے جذبات کا صحیح اندازہ شاید تم اس طرح قائم کر سکو۔ اگر میں کہوں۔ کہ یہ میری آرزو ہے۔ کہ جہاز مصر جانے کی بجائے آباد کرہ زمین کی تمام وسعتوں سے دور ہو کر خلا میں تحلیل ہو جائے، یا کسی ایسی جگہ پہنچ جائے۔ جہاں انسان کی دغاباز فطرت کو نشوونما پانے کا موقع نہ ملا ہو۔

اور جو "رہتے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو" کی آئینہ دار ہو۔

غالب کو خدا جنت میں نہ لے جائے۔ وہاں انسان ہونگے۔ اور جہاں انسان ہونگے۔ وہاں وہ تمام چیزیں ہونگی، جن کے مجموعے سے انسانیت مُراد ہے۔ انسانیت ہوگی۔ تو وہ تمام کمزوریاں ہونگی۔ جو انسانیت کا خاصہ ہیں۔ وہ تمام فطرتی بُرائیاں ہونگی۔ جو انسانیت کا لازمہ ہیں۔ غالب کہ انسانیت کے ان رموزِ حیات کا پردہ کُشا ہے۔ ان باتوں کو کسطرح برداشت کر سکیگا۔ اس شعر کے معنی آج منکشف ہو رہے ہیں کہ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تم جانتے ہو نا کہ مجھے نکہت سے کس طرح عشق ہوا۔ کینیڈ کالج لاہور کی گریجوایٹ نکہت، وہ نکہت جس کی آنکھیں ستاروں کی طرح روشن اور جسکے بال رات کی طرح سیاہ تھے۔ جسکے رنگین لبوں پر تبسم کی مختلف دنیائیں لرزتی تھیں۔ جس کے جسم کی نزاکت گلاب کی لچکدار شاخ کی آئینہ دار تھی۔ جسکی گفتگو شیریں اور جس کی نگاہ خمار انگیز تھی۔ جس کے انداز فطرت کی تعلیم سے لبریز تھے اور جس کی تہذیب وضعداری کے پہلوؤں میں مغلیہ عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔

شاید عشق کے فسانوں میں سب سے بڑی اور اہم "باطل نما حقیقت" یہ ہے۔ کہ جو لوگ مستیٔ تحریر اور رنگینیٔ انشاء کے لئے مخصوص تصوّر کئے جاتے ہیں محبّت ان کے لبوں پر خاموشی اور شرم کی ایک مہر لگا دیتی ہے۔ یہی بات مجھ سے ہوئی۔ افسانے لکھ لکھ کر میں رسمیات تعشق سے اسقدر مانوس ہو گیا تھا۔ کہ نکہت کی موجودگی میں انہیں باتوں ... کو دہرانا جو میں افسانوں میں لکھتا تھا۔ گناہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں گھنٹوں اپنے خلوص عشق کے متعلق تقریریں تیار کرتا رہتا۔ ایسی تقریریں کہ اگر اُن میں سے میں کسی ایک کو شائع کر دوں، تو شاید مملکت دلبری میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتے۔ لیکن جس وقت نکہت میرے سامنے آتی تو یوں محسوس ہوتا۔ گویا کسی عظیم ذہنی کشمکش میں حواس کی طاقتوں کو سلب کر کے گویائی کو نگاہوں کے مسترحمانہ انداز میں چھپا دیا ہے۔ اگر نگاہوں کے پیغام دیارِ عشق میں رائج نہ ہوتے۔ تو شاید تمام عمر نکہت کو پتہ نہ چلتا۔ کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔

نعیم تمہیں یاد ہے نا۔ کہ جب میری اور تمہاری، محبت کے موضوع پر گفتگو ہوا کرتی تو میں اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ "صرف محبت ہی انسان کی چند روزہ حیات میں کوئی ضروری چیز نہیں۔ بلکہ اُس کے ساتھ زندگی کے دوسرے فرائض ہیں۔

جو بعض وقت محبت پر تفوق حاصل کرتے ہیں۔ کسی دوسرے فرض کا جذبات عشق پر غلبہ حاصل کرنا قربانی کہلاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ محبت بغیر قربانی کے محبت نہیں کہی جاسکتی"۔ تمہیں یاد ہے نا تم جواب دیا کرتے تھے "ابھی تک تمہیں محبت سے واسطہ نہیں پڑا" اور خاموش ہو جاتے تھے۔

لڑائی چھڑ گئی۔ اور پشتہا پشت کی وہ سپاہیانہ زندگی جو میرے خاندان سے مخصوص تھی۔ اس میں تحرک کی روح دوڑ گئی مجھے فوج میں کپتان کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ جہاں تک میں نکہت کی طبیعت کو سمجھ سکا تھا۔ مجھے احساس تھا۔ کہ وہ مجھے فوراً لڑائی پر جانے کی اجازت دیگی۔ میرا خیال تھا کہ قربانیوں کے متعلق جو نظریے میں نے قائم رکھے ہیں، نکہت اُن سے ہم آہنگ ہوگی۔ ہماری فوج کے دستے کو عراق جانے کے قطعی احکام آپہنچے۔ اور میں جانے سے ایک ہفتہ پیشتر ہی نکہت سے مِلا۔

وہ اپنے پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی۔ ہمارا عشق جسے تم اپنے طنزیہ انداز میں مہذب عشق کہتے ہو۔ رسمیات کی جدوجہد سے بے نیاز تھا۔

میں نے کہا پیاری میں ایک ہفتہ تک جارہا ہوں۔

ہم دونوں ایک روش پر بیٹھ گئے۔ وہ سفید لباس پہنے تھی۔ اور

اُس کی آنکھوں میں مسرت کا وہ اہتزاز موجود تھا۔ جس کے لئے لوگ اپنی جانیں دے دیتے ہیں۔ جس کے لئے فرانس میں "ڈوئل" لڑے جاتے ہیں۔ جس کے لئے بادشاہ کے برخلاف علم بغاوت بلند کیا جاتا ہے۔ جس کے لئے زندگانی کی تمام مسرتیں قربان کی جاتی ہیں۔ جس کے لئے جان کی تکلیف نشاطِ حیات متصور ہوتی ہے۔

میری بات سُنکر اُس کی آنکھیں یکایک نم آلود ہو گئیں۔ اور آنسوؤں کے دو قطرے جن کی شبنم مثال تابانی شاید اُس نور سے پیدا کی گئی تھی۔ جس سے فرشتوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ اُس کے روشن رخساروں پر ڈھلک پڑے۔ وہ خاموش رہی لیکن جانتے ہو تا اُسکی خاموشی کسقدر طعن خیز تھی۔ وہ مجھے ملامت کر رہی تھی۔ کہتی تھی۔ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے، اور رو رہی تھی، رو رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ نکہت نے بھی اپنے فرض کا احساس نہ کیا۔ میں نے اپنے دل کو کڑا کر کے کہا۔

"آج سے چوتھے دن میں پھر رخصت لینے آؤنگا" لیکن میں جھوٹ بول رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں مسرت پھر لہر بنکر دوڑ گئی مجھے معلوم تھا۔ کہ اس مسرت کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ اُس دن مجھے جانے سے روک لیگی۔ اور اپنی محبت کو اپنے فرض کے احساس پر مقدم سمجھے گی۔ واپس جاتے وقت میرے پاؤں سو سو من کے

ہو رہے تھے۔ میں بغیر اس سے ملے۔ لڑائی پر چلا گیا۔

دو سال کے بعد میں واپس آیا۔ اور خط کے ذریعے اُسے اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کیا۔ اپنے قلب میں اُس آتشیں شعلے کا گداز لے کر جسے فرقت کہتے ہیں۔ اور اس شادابی تمام کی گل ریزیاں لیکر جسے وصل کہتے ہیں۔ میں اُسی پائیں باغ میں جا پہنچا۔

نکہت اور ایک نوجوان شخص اُس روش پہ وہیں جہاں میں اُس سے رخصت ہوا تھا۔ بیٹھے تھے۔ نکہت کے رخسارے تمتما رہے تھے۔ عین اُس طرح جس طرح ایک کمسن لڑکی کے رخسارے اُس وقت تمتما اُٹھتے ہیں۔ جب اُس کا محبوب اُس کے کان میں کوئی بے معنی مگر لطیف بات کہے

میں اُلٹے پاؤں واپس آگیا۔ اب مصر جا رہا ہوں خدا جانے کیوں۔ شاید اس لئے کہ وہاں خلاق فطرت نے حسن اور اس کی دغا بازی کو قلوپطرا کے جسم میں متشکل کر کے زمین کو آلودہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ میرا پتہ کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ میں ایک جگہ نہیں ٹھیرونگا۔ خدا حافظ۔

تمہارا بدنصیب دوست
کلیم

نکہت کا خط اپنی سہیلی اختر کے نام

پیاری اختر۔ تمہارا خط ملا۔ شاید تم نے خط میں زہریلے نشتروں کو ملفوف کر کے بھیجا تھا۔ جس سے میرا ذہنی کرب بہت بڑھ گیا ہے۔ میں نے شادی کرنے سے کیوں انکار کیا۔ اس کا جواب پوچھتی ہو۔ شاید تم میرے منگیتر کو نہیں جانتیں جب تک مجھے یہ اُمید ہے۔ کہ وہ واپس آجائے گا۔ اُس وقت تک تو میری شادی قطعاً ناممکن ہے۔ اور اس امید کے فنا ہو جانے کے بعد اگر میری شادی ہوئی تو محض اس لئے ہوگی۔ کہ صنفِ نازک کی خون آلود تاریخ میں قربانی کے ایک نئے باب کا اضافہ ہو۔

اُس کا قد چھ فٹ سے اُونچا تھا۔ ہلکی نیلگوں آنکھیں۔ اور ایسی بلند آواز ہنسی جو شاید زمانۂ ماقبلِ تاریخ میں سُنی جاتی ہو گی۔ باوجود اس ڈیل ڈول کے اُس کا چہرہ بھولپن کا مکمل نمونہ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نیک نیتی کی وہ خطرناک چمک موجود تھی جسکو دیکھ کر گناہ کا ضمیر کانپ جاتا ہے۔

آہ۔ اختر۔ میں نے اس شخص سے محبت کی۔ اس سنگ مرمر کے مجسمے سے محبت کی۔ جو زندگی کے پتھریلے پہلوؤں سے تراشا گیا تھا۔

اختر جانتی ہو ناعورتیں کبھی کبھی بتوں سے بھی محبت کیا کرتی ہیں۔ سچ کہنا۔

کبھی تم نے تو ایسے شخص سے محبت نہیں کی۔ اگر کی ہے تو مبارکباد کی مستحق ہو۔ اگر نہیں کی، تو یاد رکھنا اپنے دل و دماغ کی نباہی کیلئے اس سے بہتر وسیلہ اور کوئی نہ پاؤ گی فریب کاری حسن کی کونسی بہارِ نازایسی ہوگی، جو اس کے انجمادِ حیات کو کم کرنے کے لئے صرف نہیں کی گئی۔ لیکن اسکی وہ خطرناک نیلگوں آنکھیں جنکو دیکھ کر گناہ کا ضمیر کانپ جاتا تھا، شعلۂ عشق سے اسی طرح بے نیاز رہیں۔ جن دنوں لڑائی چھڑ گئی۔ صرف اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ شاید وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ اور آخر کار انہیں دنوں اس نے بے معنی لفظوں میں مبہم سے فقروں میں اپنے تعشق کا اظہار کیا۔ انہیں دنوں ہماری نسبت قرار پا گئی۔ میں مسرور تھی۔ اس مسرتِ قلب کو بیان کرنے کے لئے۔ غالب کی شوخی تحریر درکار ہے۔ مجھ سے تو بن نہ آئے گا۔ آخر جب تم ایسے شخص سے محبت کرو گی جو تمہارے بس کا نہ ہو، اور اپنے بے پناہ سکون سے تمہاری شورشِ عشق کو مجروح کر رہا ہو۔ اور پھر اتفاقی طور پر یکایک تم اسے پالو گی۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔

فوجی خاندان کا وہ چشم و چراغ لڑائی پر جانے کے لئے تیار ہو کر مجھ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ اور اس کا لہجہ اس قدر محبوب تھا کہ میری آنکھوں میں مسرت کے آنسو جھلک اٹھے۔ آہ شاید وہ اپنی کامیابی کی اس روشن دلیل کو دیکھ کر مجھ سے

برگشتہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ کہ مَیں تم سے پھر رخصت ہونے کیلئے آؤنگا۔ اور وہ نہ آیا ہائے اختر۔ کیا مَیں اُسے روکتی، کیا اگر وہ جانا چاہتا تو مَیں اُسے روک سکتی تھی۔ مَیں جو اسکی خواہشوں کے سمندر میں تنکے کیطرح بہے چلی جا رہی تھی۔ لیکن اُسے مجھ سے پیار ہی کب تھا۔ وہ نہ آیا۔

اختر اس ستم ظریفی پر ماتم کرو۔ کہ اُسے مجھ سے عشق نہیں۔ اور وہ رسمی طور پر پیار کے لہجے میں مجھ سے رخصت طلب کر رہا ہے۔

اختر اس ستم ظریفی پر ماتم کرو ——————

دو سال کے بعد اس نے مجھے خط لکھا کہ میں آ رہا ہوں۔

عورت کا دل فریب کے نقوش کو بہت جلد قبول کرتا ہے میں نے سوچا شاید وہ آ ہی جائے۔ میرا چچازاد بھائی جو دس سال بمبئی میں پڑھتا رہا تھا۔ ایک دن پہلے گھر واپس آیا۔ اُس نے میری شادی کے متعلق کوئی تذکرہ کیا، تو مَیں نے ایسی مسرتِ قلب سے اپنے منگیتر کا نام لیا۔ کہ وہ بھی سمجھ گیا۔ کہ مجھے کلیم سے عشق ہے ہم دونوں اُس روش پر جا بیٹھے، جہاں کلیم مجھ سے رخصت ہونے آیا تھا۔ وہ مجھے کلیم کے آنے کی مبارک باد دے رہا تھا۔ اور میں اپنی کوشش تمام کے باوجود بھی اس احساس عشرت کو کم نہ کر سکتی تھی، جو میرے رخساروں کو سرخ کر رہا تھا۔

افسردہ اُس دن بھی نہ آیا۔

کیا ان حالات کے باوجود میں شادی کر سکتی ہوں۔ کہیں دُنیا کی لامحدود فضا میں ایک چھ فٹ لمبا شخص جس کا چہرہ ایسے ڈیل ڈول کے باوجود بھولپن کا مکمل نمونہ ہے آوارہ پھر رہا ہے آنکھوں کی اُن خطرناک نیلگونیوں کے ساتھ جن کو دیکھ کر گناہ کا ضمیر کانپ کانپ جاتا ہے۔

وہ میرا منگیتر اور میرا محبوب ہے

تمہاری

بدنصیب سہیلی

نکہت

ورق

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ

بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے

مُسافر

انتہائی کوشش کے باوجود مجھے نیند نہ آئی۔ ممکن ہے کہ شور میری بے خوابی کا باعث ہوا ہو۔ بہرحال یہ درست ہے۔ کہ جہاز کا ہر ایک حصّہ کراہ رہا تھا چیخ رہا تھا۔ ٹھنڈی سانسیں بھر رہا تھا۔ میرے ساتھ کے کمرے میں کوئی شخص ڈک کے تختے اکھیڑنے کی مشق میں مصروف تھا۔ گویا ایک شیطان میرے سر پر آرا چلا رہا تھا۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ جہاز کی مسلسل حرکت بھی خواب آور نہ تھی۔ ماسوائے اس مقناطیسی طاقت کے جو انسان کے ارادے میں موجود ہوتی ہے مجھے اپنے بستر پر لیٹے رہنے میں کوئی چیز مدد نہ دے سکتی تھی۔ اگر میں اپنی قوتِ ارادی کا استعمال ایک لمحے کے لئے بھی ترک کر دیتا۔ تو یقیناً زمین پر جا رہتا۔

اسی اثنا میں میرے برتھ کے نیچے سے میرا ٹرنک لڑھک کر باہر آ گرا۔ میں نے بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ تاکہ اس کی حرکات کا مشاہدہ کر سکوں۔ میرا ٹرنک باوقار

اور متین انداز سے کمرے سے باہر نکلنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ جہاز کو خیرباد کہنا چاہتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ اس معاملے میں مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی۔ کہ ابھی ٹرنک دروازے تک بھی نہ پہنچا تھا۔ کہ میرا سوٹکیس بھی باہر آیا۔ اور ٹرنک سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نے بتی بجھا دی اور ان دونوں کو اندھیرے میں اپنے اختلافات طے کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ تو ایسا معلوم ہوتا رہا۔ گویا مباحثہ بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ اور ان دونوں میں سے کوئی ایک اپنی جگہ سے انچ برابر بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ مگر کچھ عرصے کے بعد نسبتاً خاموشی ہو گئی۔

مجھے خیال آیا کہ گذشتہ شام کو کسی یاس آشنا صاحب نظر نے کہا۔ تھا۔ کہ ہمارا جہاز مناسب بوجھ سے زیادہ گرانبار ہے۔ اور اگر طوفان آیا۔ تو یقیناً دو ٹکڑے ہو جائیگا۔ اس کے بعد ایسا خیال گزرا۔ کہ میں کسی حبشی سے شطرنج کھیل رہا ہوں۔ جو بار بار کہتا تھا "جب میں کالے مہروں کی چال چلتا ہوں۔ تو میرا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور سفید مہروں سے کھیلتا ہوں۔ تو گورا ہو جاتا ہوں"

ابھی میں کھیل ہی رہا تھا۔ کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور آواز دی۔ کہ "نہانے کے لئے پانی تیار ہے"

آخری بات سچ ثابت ہوئی۔ کیونکہ حبشی والا کھیل تو خواب نکلا۔ میں نہانے کیلئے گیا۔ تو پانی مجھے آغوش میں لینے کے لئے بیتاب نظر آتا تھا۔ آخر کار وہ اپنی بے تابی اور اضطراب سے مجبور ہو کر میرے گلے آہی لگا۔ اس کے بعد جب پانی اور میں آپس میں خوب لڑ جھگڑ لئے۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ سٹیورڈ (جہاز کا خادم) میری چائے لئے ہوئے عرشہ جہاز اور اپنے جسم کے درمیان ۴۰ درجے کا زاویہ بناتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں طعام خانے کی طرف چلا گیا۔ بہت کم لوگوں (رات کے خوابہائے پریشاں کے بعد) نے آنے کی تکلیف گوارا کی تھی۔ مگر بیگم نرجس موجود تھیں۔

بیگم نرجس حسن اور لطافت کی دیوی تھی۔ مگر آج اس کے چہرے پر کچھ افسردگی کے سے آثار نظر آتے تھے۔ معمولی علیک سلیک کے بعد بیگم بولی "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ آپ کو فرصت ہے نا؟ اچھا تو کھانے کے بعد اوپر عرشہ پر تشریف لائیے گا۔"

بیگم نرجس جہاز کے سفر کی عادی تھی۔ اور اس سے پیشتر کئی بار چھوٹے چھوٹے معاملات میں مجھ سے مشورہ لیتی رہتی تھی۔ میرا خیال تھا۔ کہ اس دفعہ بھی وہ کسی بات کے متعلق مجھ سے مشورہ لے گی کھانے کے بعد میں اوپر کے عرشے پر آگیا۔ تو وہ ایک کرسی پر قیمتی سمور اور قاقم کے درمیان لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ اس پر سمندر کے سفر کا کوئی اثر نہیں۔ اُس نے مجھے بتایا۔ کہ وہ تمام رات نہیں سوتی۔ میں نے اُسے رات کے خواب سنائے۔ اگر کوئی اور دن ہوتا۔ تو یقیناً وہ مسکرا دیتی۔ کیونکہ اس کے لب تبسم ہی کے لئے بنائے گئے تھے مگر آج وہ خلافِ معمول افسردہ رہی۔ اور لہروں پہ نظر گاڑے ہوئے میری باتیں سنتی رہی گویا الفاظ تو سن رہی ہے۔ مگر معانی سے بالکل ناواقف ہے۔

بیگم نرجس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس کا حسن خوشنما تراکیب اور مرصع الفاظ سے بالا تھا۔ شاعر کے خواب اسقدر شیریں و دل آویز نہیں ہو سکتے فردوس کا تصوّر اتنا رنگین نہیں کہلا سکتا۔ اس کا چہرہ آنکھوں کے ساتھ دل کو بھی جذب کر لیتا تھا۔ اور پھر یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا دل ان گھنگریالے بالوں کی گرہوں میں کھویا گیا ہے۔ جو اس کی پیشانی کو چومنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے

میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ کہ ایک ہندوستانی عورت اس قدر مہذب....

.....اس قدر ہنس مکھ، اس قدر خوبصورت کیونکر ہو سکتی ہے۔ کئی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ کہ شاید کسی اور ملک کی رہنے والی ہے۔ مگر اس کی گفتگو صاف اور شستہ اور بولنے کا انداز اور لہجہ تمام چیزیں اس خیال کی تکذیب کرتی تھیں۔

جہاز کے مسافروں کے لئے اس کی ذات ایک معمّے سے کم نہ تھی۔ یہ تو سب جانتے تھے۔ کہ وہ ایک ہندوستانی عورت ہے۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کہاں سے آرہی ہے اور کہاں جارہی ہے۔

میں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہوا میں نسبتاً سکون پیدا ہوا گیا ہے۔ اُمید ہے آج رات چین سے گزرے گی۔ آپ کچھ افسردہ نظر آتی ہیں۔ کیا بات ہے؟"

اس نے یاس سے لبریز آواز میں جواب دیا "میرا خیال ہے۔ کہ آپ میری مدد نہیں کر سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ آپ نے اکثر اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں میں مجھے اپنے مشورے سے فائدہ پہنچایا ہے۔ مگر..... کاش میں اس جہاز کی کپتان ہوتی۔"

"تو آپ کیا کرتیں؟"

"میں جہاز کا رخ واپس انگلستان کی طرف موڑ دیتی۔"

"ناممکن ہے۔ جہاز کے ذخائر میں اتنا کوئلہ ہی موجود نہیں ہے۔ بہرنوع اس حیرت انگیز خواہش کی وجہ تو ارشاد فرمائیں۔"

نرجس نے غور سے اپنے نازک صاف ہاتھ کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ آخر

بولی "بات یہ ہے۔ کہ میں ڈر گئی ہوں"

میں نے حیرانی سے بیگم کی طرف دیکھا۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ وہ واقعی بہت خوفزدہ معلوم ہوتی تھی۔

میں نے کہا "بیگم نرجس۔ مجھے معاف کیجئے گا لیکن یہ تو حد درجہ کی حماقت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ جہاز بہت بوجھل ہے۔ اور ڈولتا بھی زیادہ ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ ہم ہر طرح سے محفوظ ہیں"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ اس قسم کی باتوں سے مجھے خوف نہیں آتا۔ بات اور ہی ہے۔ اور جب میں آپ کو افسانہ سناچکونگی۔ تو آپ سمجھینگے۔ کہ شاید میرے دماغ میں فتور آگیا ہے"

میں نے کہا "میں ہرگز ایسا خیال نہیں کر سکتا"

"اچھا۔ "میں نے آپ کو بتلایا تھا۔ کہ میں بیوہ ہوں۔ لیکن میں نے آپ کو اس بات کی اطلاع نہیں دی تھی۔ کہ میرے خاوند ڈاکٹر ظہیر حسین صرف تین ماہ ہوئے۔ لنڈن میں فوت ہو گئے۔ نہ میں نے آپ سے اس بات کا ذکر کرنا مناسب خیال کیا تھا۔ کہ میں ہندوستان ایک اور شخص سے شادی کرنے کے ارادے سے جارہی ہوں"

"خوب آگے چلئے۔"

"میرے خاوند کو مرے ہوئے تین ماہ ہو گئے۔ لیکن کل میں نے اُسے جہاز پر دیکھا ہے۔"

بیگم نے یہ متحیر کن فقرہ انتہائے سکون و دلجمعی سے کہا۔ گویا اس میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی ناممکن ہے۔ کہ دن کے نو بجے جب سورج چمک رہا ہو۔ اور دھوپ تمام چیزوں کو اپنی روشنی میں رنگ کر درخشاں کر رہی ہو۔ آپ بھوتوں یا روحوں کے فسانے سنا کر کسی کو بہت جلد متاثر کر سکیں۔ میں تو سوچنے لگ گیا۔ کہ آخر اسکے ذہن میں اس قسم کا خیال آیا کیسے۔

آخر کار میں نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ یہ ناممکن ہے۔"

"ہاں کل تک میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"اور کل بھی آپ کا یہی خیال ہو گا۔ آپ فرمائیں۔ کہ آپ نے کیا دیکھا ہے۔ میں آپ کو قائل کر دونگا۔ کہ بھوت اور روح کو اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کل رات کو گیارہ بجے کے قریب جب میں اپنے کمرے کے پاس پہنچی۔ تو دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے بجلی کا لمپ جلا دیا۔ اس وقت میرا خاوند میرے برتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔

روشنی اس کے سر کے ان حصوں پر چمک رہی تھی۔ جو بالوں سے خالی تھے۔ وہ پرانا آسمانی رنگ کا سوٹ پہنے، تھا۔ اور پاؤں میں سرخ رنگ کے سلیپر تھے جو وہ ہمیشہ پہنا کرتا تھا۔ اس کے کوٹ کی جیب کسی شے سے بوجھل معلوم ہوتی تھی۔ اس نے مڑ کے میری طرف دیکھا۔ اس کا سر آہستہ آہستہ مڑ رہا تھا۔ اس طرح گویا وہ بہت کوشش سے کام لے رہا ہے۔ اب تک میرے دل میں قطعاً خوف نہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن جب اُس نے اپنا چہرہ پوری طرح میری طرف پھیر لیا۔ تو میں ڈر گئی بہت ڈر گئی۔ وہ میرا خاوند تھا۔ اور جیسے نہیں بھی تھا۔"

"یہ کس طرح"

"کم از کم اس کا چہرہ تو بالکل میرے خاوند کا سا تھا۔ داڑھی مونچھیں مُنڈی ہوئیں۔ ماتھے پر جھریاں (وہ مجھ سے ۲۰ سال عمر میں بڑا تھا۔) گنجان بھویں۔ اور بہت ہی چھوٹا سا منہ۔ دراصل اِس کا منہ غیر فطری طور پر چھوٹا تھا۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ جب کوئی شخص آپ کی طرف دیکھے۔ تو فطرتاً آپ کو یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ اس کی آنکھیں آپ ہی کی طرف ہیں۔ لیکن اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ عین اسی طرح جس طرح موت کے بعد اس کی آنکھیں ہو گئی تھیں۔ اور پھر اس طرح معلوم ہوتا تھا۔ گویا خود میرا خاوند موجود نہیں۔ بلکہ اس کی جگہ موم کا بُت بنا کے اُس پر نقش و نگار کر دیئے گئے ہیں۔

میں نے خوف سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ تاہم میں یہ کہنے سے نہ رہ سکی۔ "تم کیوں آئے ہو"؟ اس کے لبوں کو خفیف سی حرکت ہوئی۔ اور اس کے بعد اس کی آواز نکلی۔ اس طرح جس طرح کوئی بچہ سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہے تھکی ہوئی لرزتی ہوئی۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں"۔ اس کے بعد خادمہ آ گئی۔ اور اس کی شکل غائب ہو گئی۔

"آپ نے خادمہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی"۔؟

"نہیں۔ اس وقت میرا ارادہ تھا۔ کہ میں اس واقعہ کی اطلاع کسی کو بھی نہ دوں میں نے خادمہ پر یہ ظاہر کیا کہ میں جہاز کی حرکت سے ڈر گئی ہوں۔ اور کافی عرصہ میں نے اُسے باتوں میں لگائے رکھا۔ خادمہ چاہتی تھی۔ کہ ڈاکٹر سے کوئی خواب آور دوا لے آئے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا"۔

"کیوں؟"

"مجھے نیند سے خوف آنے لگا تھا۔ میں ڈرتی تھی۔ کہ اگر میں نے خواب میں اُسے دیکھا۔ تو شاید مر جاؤنگی۔ میں چاہتی تھی۔ کہ میں اس کے لئے تیار رہوں۔ میں جانتی ہوں۔ کہ وہ کیوں میرے سامنے ظاہر ہوا ہے"۔

"آپ نہیں جانتیں بیگم! کہ وہ کیوں آیا ہے۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں۔ کہ کیا ہوا ہے اس واقعے کی وجہ بالکل صاف اور سادہ ہے"

"وہ کیا؟"

"آپ کے واہمے کا باعث محض سمندری سفر کی تکلیف تھی"

"لیکن مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی"

"درست ہے۔ اگر آپ سمندر کے سفر کی تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتیں جس طرح باقی مسافر کر رہے ہیں۔ تو آپ کو یہ شکل بھی کبھی دکھائی نہ دیتی۔ اس سفر میں دماغ اور معدہ ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل کرتے رہتے ہیں۔ جہاز کی نقل و حرکت بھی بینائی کی قوت کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ بعض صورتوں میں دماغ خاص طور پر متاثر ہو جاتا ہے۔ اور نتیجہ واہمے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس واقعے کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ اور سمندر کے سفر کی تکالیف کے اثرات محض تخلیقی قوت کے اختراعی نتائج تھے۔ بیگم نرجس کو خوف مارے ڈالتا تھا۔ اور میرا فرض تھا۔ کہ میں کوئی نہ کوئی تدبیر سوچوں۔

"اگر میں یہ سمجھ سکوں۔ تو مجھے کسقدر اطمینان ہو جائیگا"

"آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں کم از کم حقیقت یہی ہے"

اس کے بعد میں نے اُسے اِس طرح کے کئی فرضی واقعات سنا کر اس کو تشفی دینے کی کوشش کی۔

آخر کار اس نے کہا۔" کاش مجھے یہ واقعات پہلے معلوم ہوتے۔ مجھے خوف سے زیادہ اور کوئی چیز ہیبت ناک نہیں معلوم ہوتی۔ کل جس وقت میں لمپ جلا کر اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے خیالات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ واقعی خوف انسان کو فاتر العقل بنا سکتا ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ مجھے ڈرنے کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔ اور وہ وجہ یہ تھی۔ کہ میرا خاوند شکی مزاج تھا۔ اور دراصل شکوک و شبہات ایک حد تک درست بھی تھے۔"

بیگم نرجس نے مجھے اپنی زندگی کے واقعات سنانا شروع کئے۔

"میں ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اور میرے والد مشہور تاجر تھے دولت دنیا سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے تعلیمیافتہ بھی تھے۔ انہوں نے میری تعلیم و تربیت خالص مغربی انداز میں کی۔ جب میں ۱۸ سال کی ہوئی۔ تو اُن کا انتقال ہو گیا۔ میری والدہ اس وقت زندہ تھیں۔ انہوں نے کاروبار اپنے ہاتھ میں لیا۔

نقصان پر نقصان ہوتا گیا۔ اور آخر کار مجھے اپنے خاندان کی عزت بچانے کی خاطر ڈاکٹر ظہیر الدین سے شادی کرنی پڑی۔ کہ وہ ہمارے سب سے بڑے قرض خواہ

تھے۔ ہماری شادی جیسا کہ ظاہر ہے۔ محض ایک کاروباری نقطۂ نظر سے کی گئی تھی۔ اور اس میں محبت کا کوئی عنصر شامل نہ تھا۔

شادی سے پہلے میری منگنی ایک نوجوان صناع سے ہو چکی تھی۔ جو بنارس میں موسیقی کے پروفیسر تھے۔ شادی کے دوران میں بھی مَیں نے اُن سے خط و کتابت جاری رکھی۔ اتفاق سے میرے خاوند کو اس بات کا علم ہو گیا۔ چنانچہ وہ مجھے ہندوستان سے انگلستان لے آئے۔ اور وہیں میں نے اپنی عمر کے، سال گذارے مجھے اعتراف ہے۔ کہ اس دوران میں بھی میں نے اپنے سابق منگیتر کو خط لکھنے سے گریز نہیں کیا۔ اور یہ ایک غیر شریفانہ حرکت تھی۔ مگر مجھے امید ہے۔ کہ خدا میرے اس گناہ کو میری محبت کی صداقت اور پاکیزگی کے صدقے معاف کر دیگا۔

ان تمام باتوں کا خیال کرتے ہوئے میں سمجھتی ہوں۔ کہ شاید میرا خاوند مجھے تنگ کرنے کے لئے اور مجھے شادی سے روکنے کے لئے آگیا ہو۔"

میں نے کہا "مطمئن رہیئے۔ روحیں انسانوں کو تنگ کرنے کیلئے نہیں آتیں مگر دماغ ضرور واہمہ کا موجب ہوتا ہے۔"

(۲)

اس واقعے کے بعد بیگم نرجس کی افسردگی کسی حد تک رفع ہو گئی۔ اس کے بعد

میں نے جہاز کے ڈاکٹر کو تمام افسانہ سنایا، مگر انہوں نے کوئی واضح رائے دینے سے انکار کیا، میرا اپنا خیال تھا، کہ اب کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آئے گا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

دوسری شام کا واقعہ ہے۔ کہ مسٹر احمد حسین مجھے کھینچ کر اپنے کمرے میں لیگئے وہ بمبئی میں انگریزی ادب کے پروفیسر تھے، اور گپیں ہانکنے کے اس قدر عادی کہ بعض اوقات صبح سے شام تک باتیں ہی کرتے چلے جاتے تھے۔

جب ہم کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تو وہ بولے "آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔ کہ میں ایک بار جس شخص کا چہرہ دیکھ لوں، پھر مدت العمر اس کو فراموش نہیں کر سکتا، چہرے کے نقوش میرے حافظے پر اس طرح ثبت ہو جاتے ہیں کہ میں ایک دفعہ دیکھنے کے بعد آدمی کو لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں، عجیب اتفاق ہے، کہ کل میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے جسے میں نے اس سے قبل جہاز پر نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت فرسٹ کلاس میں ۷۰ آدمی سفر کر رہے ہیں، اور مجھے ان تمام کی صورتیں بخوبی یاد ہیں، مگر جس شخص کو کل میں نے دیکھا تھا، وہ فرسٹ کلاس کے ایک کمرے سے نکل رہا تھا۔ اور مجھے اس کا چہرہ بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا"

میں نے دلچسپی لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بیمار ہوگا"

"شاید"

پھر میں نے چونک کر کہا "یہ تو بتایئے اس کا چہرہ کس قسم کا تھا"

پروفیسر صاحب نے جواب دیا "اس کی عمر کوئی ۵۰ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی سر سے گنجا تھا، اس کی جیب کسی بوجھل چیز سے گرانبار معلوم ہوتی تھی، اور سرخ سلیپر پاؤں میں تھے، اس کا چہرہ خصوصیت سے جاذبِ توجہ تھا، اس کا منہ بہت چھوٹا تھا، میں نے آج تک ایسا چھوٹا منہ نہیں دیکھا لیکن عجیب بات یہ تھی، کہ ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا کسی نے مومی بت بنا کر بعد میں اسے رنگ دیا ہے، وہ جیتا جاگتا نہیں معلوم ہوتا تھا وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، گویا اپنی زندگی سے بیزار ہے"

میں نے پوچھا "آپ نے اس واقعے کا ذکر کسی اور سے تو نہیں کیا؟"

"مجھے یاد آتا ہے، کہ میں نے بیگم نرجس سے اس واقع کا ذکر کیا تھا"

میں ان سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ پروفیسر کے افسانے نے میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات پیدا کر دیئے تھے، میں نے جو سمندر کی تکلیف کا افسانہ وضع کیا تھا وہ تاش کے پتوں کی طرح زمین پر آرہا، سچ تو یوں ہے، کہ میں خود بھی اس سرخ سلیپر والی روح سے ملنے سے خائف تھا، مجھے خوف تھا کہ کہیں راہ میں میری ملاقات بھی اتفاقیہ طور پر اس سے نہ ہو جائے، لیکن اس سے زیادہ مجھے بیگم نرجس کا خیال تھا، اس کی حالت کا تصور بھی مجھے

پریشان کرنے کے لیے کافی تھا، میں سیدھا بیگم کے کمرے کی طرف چلدیا۔"

بیشتر اس کے کہ میں دروازہ کھولوں، بیگم خود باہر نکل آئی، اس کا منہ کھلا تھا، اور وہ ایک ہاتھ اپنے گلے پر رکھے تھی، دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازے کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا، گویا کسی شخص کو باہر آنے سے روکنا چاہتی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے چیخ ماری اور بے اختیار رونے لگ پڑی۔

اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "ضروری ہے کہ میں سمندر میں کود جاؤں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا مجھے اس کے پاس جانا پڑیگا۔"

"آپ نے کوئی پریشان کن خواب دیکھا ہے، بیگم، اور آپ ڈر گئی ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔"

نہیں نہیں، یہ خواب نہیں تھا۔"

بیگم نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "آپ ذرا یہیں کھڑے رہیے، ابھی تک "وہ" اندر موجود ہے۔"

میں نے جرأت سے کہا "نہیں یہ بات غلط ہے، آیئے میں آپ پر ثابت کردوں کہ یہ بات غلط ہے۔"

میں نے دروازہ کھولا، اندر گھپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

بیگم نے کہا، "میں نے تو لمپ جلایا تھا۔"

"ٹھیک ہے، مگر آتی دفعہ آپ کی آستین کی رگڑ سے سوئچ اُٹھ گیا ہوگا۔"

میں نے پھر بٹن دبایا، کمرہ بالکل خالی تھا۔ بستر پر کپڑے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے، اور ایک تکیہ زمین پر گرا تھا۔

میں نے بیگم کو تسلی دی، اور آخر کار کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ اس قابل ہوئی، کہ افسانہ سُنا سکے۔

بیگم نے کہا: "آج صبح مسٹر احمد حسین نے مجھے بتایا کہ انہوں نے بھی میرے خاوند کو دیکھا ہے، یوں تو اسی وقت سے میرے دل میں خوف کا ایک طوفان بپا تھا، مگر شام کو جب میں اپنے کمرے میں آئی، اس وقت تو کمرے کی ہر ایک شے مجھے ڈراؤنی اور خوفناک معلوم ہوتی تھی، میں نے آکر بتی روشن کی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے خاوند کی روح میرے کمرے میں موجود ہے، اس نے مجھے دیکھ کر ایک قدم آگے بڑھایا، اور اپنی مردہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالکر کہا "نرجس میرے پاس آجاؤ، سمندر میں کود پڑو، میرے پاس پہنچ جاؤ گی، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں، آؤ نرجس"

اس کے بعد مجھے ہوش نہیں کیا ہوا، پھر شاید میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔"

یہ تمام خواب کی سی بات ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ آپ تھک کر سو رہیں، اور اس کے بعد خوف کے مارے آپ کو یہ بھی یاد نہیں رہا، کہ آپ نے خواب دیکھا ہے، لیکن یہ تو بتایئے، کہ یہ آپ نے کس طرح کہا، کہ مسٹر احمد حسین نے آپ کے خاوند کی روح کو دیکھا ہے؟"

"وہ کہتے تھے، کہ انہوں نے ایک شخص کو سرخ سلیپر پہنے ہوئے فرسٹ کلاس کے ایک کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "یہ خوب رہی، وہ تو مسٹر نسیم حسین تھے۔"

میں نے فوراً مسٹر نسیم حسین ایک فرضی شخصیت کا نام لے کر اپنی قوت تخلیق کا ثبوت دیا

"مگر مسٹر احمد حسین تو کہتے تھے، کہ انہوں نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"یہ بھی ٹھیک کہتے تھے، وہ بات یہ ہے، کہ مسٹر نسیم حسین سمندر کے سفر کے عادی نہیں ہیں، وہ اتنا عرصہ اپنے کمرے ہی میں بند رہے، کل اتفاق سے وہ نکل رہے تھے، کہ مسٹر احمد حسین نے انہیں دیکھ لیا۔"

"تو پھر سلیپر دل کا رنگ اور....."

"محض ایک اتفاق"

بیگم نرجس بالکل مطمئن ہو گئی، اس کے چہرے پر تبسم کھلنے لگا، اس نے شیریں دل آویز الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا، مجھے بیحد خوشی تھی، کہ میں نے مسٹر نسیم حسین جیسی کار آمد شخصیت کا انتخاب کر لیا تھا،

(۳)

اب تک مجھے بیگم نرجس کے خطوط موصول ہوتے ہیں۔

جسطرح اس کی صورت دلکش تھی، اسی طرح اس کی تحریر دلکش ہے، وہ معمولی الفاظ میں اس قسم کا جادو بھر دیتی ہے، کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے "شکریہ" ایک علم لفظ ہے، اور اب تو اس کی حیثیت تمدن و تہذیب کے زیر اثر ایک مُردہ رسم کی رہ گئی ہے، جسکے کوئی معنے نہیں ہیں، مگر جب یہی لفظ بیگم کے منہ سے نکلتا تھا، تو اس میں واقعی تشکر و امتنان کی دنیا لرز رہی ہوتی تھی، اس نے بارہا خطوط میں طرح طرح کے نئے طریقوں سے میرا شکریہ ادا کیا ہے، مگر میں سمجھتا ہوں، کہ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کیلئے شکریہ کا اسقدر مستحق سمجھا جاؤں۔

اس کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس نے اپنے پہلے منگیتر سے شادی کر لی ہے اور وہ دونوں ایک فردوس ارضی میں محو عشرت ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ظہیر الدین

کی روح نے انہیں تنگ نہیں کیا، علاوہ ازیں بیگم نے مجھے ایک سگرٹ کیس تحفے کے طور پر ارسال کیا ہے، جو طلائے خالص کا بنا ہے، اس کے ڈھکنے پر ایک بیش قیمت الماس جڑا ہوا ہے، افسوس ہے کہ میں اس تحفے کو لوگوں کے سامنے استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے خوف ہے، کہ اس طرح لوگوں کو میری آمدنی کے ذرائع کے متعلق ایک غلط خیال پیدا ہو جائے گا۔

بہرنوع مقام مسرت ہے، کہ بیگم نرجس کو میری تخلیقی قوت نے خوف کے ہیبتناک چنگل سے رہائی دی، یہ تو سب کچھ ہوا، مگر میرا دل مطمئن نہیں ہے، میں جانتا ہوں، کہ جس جہاز پر میں نے اور بیگم نرجس نے سفر کیا تھا، اس پر ایک ایسا مسافر بھی سفر کر رہا تھا، جسکا نام مسافروں کی فہرست میں درج نہ تھا۔

مجھے ایک ضروری کام سے واپس لنڈن جانا ہے، مگر میں اس جہاز کی بجائے کسی دوسرے جہاز کا انتظار کر رہا ہوں، میں سمجھتا ہوں، کہ اس جہاز پر ہر سفر میں ایک ایسا مسافر سوار ہوا کرے گا جس کے متعلق جہاز کے کپتان اور مالک کو کوئی اطلاع نہ ہو گی۔

میں نے قصداً اپنا نام اور جہاز کا نام پردۂ اخفا میں رکھا ہے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا، کہ جہاز کے مالک کا کاروبار خراب ہو۔ اور لوگ اس جہاز پر سفر

کرنے سے انکار کر دیں ۔

منگنی

ہوس نے کام جاں پایا محبت شرمسار آئی

منگنی

اس رات ناہید کتنی خوش تھی، خوشی کے مارے اسے نیند نہیں آئی، جب تازلی اور ریحانہ نے اسے گدگدا، گدگدا کر چھیڑا ہے، تو وہ آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی — ———— سسرال کی طرف سے جو تحفے آئے تھے، وہ کتنے نفیس اور سبک تھے، ساڑھیاں کتنی خوشرنگ تھیں، اور وہ سرخ ساڑھی جس کے کناروں پر سفید موتیوں کی جھالر تھی، اس پر کیسی پھبی تھی، جب لڑکیوں کا جھرمٹ ہٹا تھا، تو آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ کتنا عرصہ اس لچکتی ہوئی ساڑھی کی خوشنمائی کو دیکھتی رہی تھی ———— رات کو تنہائی میں جب اس نے منگنی کا جوڑا اُتارنا شروع کیا تو لجاتی ہوئی نظروں سے اپنے بدن کے خوبصورت خطوط اور خموں کی طرف دیکھنے لگی، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، سڈول جسم، موٹی موٹی آنکھیں، کندن کی طرح دمکتا ہوا رنگ، آئینہ اس کے سامنے جوانی کی مست رعنائیوں کی ایک دلکش

تصویر پیش کر رہا تھا ——————

پھر کچھ سوچ کر اور کچھ شرما کر وہ آئینہ کے سامنے سے ہٹ گئی، اور پلنگ پر بیٹھ کر ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے بہت عرصہ خوابوں کی دنیا میں گم رہی۔

کتنی حسین ہے خوابوں کی دنیا اور کتنی فریب کار ہے جوانی کی آئینہ کاری جسکا تخیل سوائے رنگینی کے اور کوئی افق نہیں رکھتا، جس کے خیالات کا سمندر سوائے رعنائی کے اور کوئی کنار نہیں رکھتا۔

اس دنیا میں وہ اپنے آپ کو ایک نوجوان مرد کی محبوب بیوی دیکھ رہی تھی، جو اسے شدت سے دیوانہ وار چاہتا تھا، اپنے منگیتر کی ایک تخیلی تصویر دھندلے سے نقشوں میں اس کے دماغ کے پردوں پر مرتسم تھی، سانولا رنگ، چوڑا چکلا جسم، گہری سیاہ آنکھیں، مردانہ حسن یہی معیار اس کے ذہن میں تھا۔ اور اسی معیاری پیکر سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔

وہ اپنے تخیل میں بیاہتا زندگی کے کئی مرحلے طے کر چکی تھی اور اپنے منگیتر کی بہنوں اور ماں کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کیا تھا، کہ اس کا خاوند وفا شعار، رنگین مزاج اور اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ ہوگا۔

اسی تخیل کی دنیا میں اسے اپنے منگیتر کا نام عشرت حسین کچھ عجیب، دلکشی

کا حامل معلوم ہوتا تھا، اس نے کئی بار زیرِ لب دہرایا، عشرت حسین! عشرت حسین اور پھر جھینپ کر بستر میں منہ دے لیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ جوانی کی بے خبر نیند سو رہی تھی۔

اسی رات حسن فروشوں کی ایک بدنام گلی میں ایک اتری ہوئی عمر کی طوائف ایک گورے رنگ کے نوجوان کے گلے میں باہیں ڈالے اسے کہہ رہی تھی،

"اب تو تمہاری منگنی ہو گئی نا، اب تو چاند سی دلہن بیاہ کے لاؤ گے، اب ہمیں کیوں پوچھو گے عشرت؟"

یہ نوجوان جسے عشرت کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، گورے رنگ بھدے جسم کا چیچک رو پچیس سال کا جوان تھا۔

نشے میں مخمور، اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم تو جان کے ساتھ ہو پیاری"، اور چٹاخ چٹاخ اس مکروہ طوائف کے گھناؤنے منہ کے بوسے لینے شروع کر دیئے

کہیں دور اسی شہر میں ایک دوشیزہ خوابِ شیریں کی دنیا میں اپنی آئندہ زندگی

کی دلکشی میں سرشار، نیند میں مسکرا رہی تھی۔

محبّت کی ایک شام

سر از پے تیغ بردن آساں نیست

آہ منظرِ خم سلام کسے!

محبت کی ایک شام

گہری تاریکی میں سعید نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس جگہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جہاں بجلی کا بٹن موجود ہونے کی توقع تھی۔ ذرا رک گیا۔ پھر یکایک ایک عظیم ذہنی طاقت سے کام لے کر اس نے انتہائی بے پروائی سے بٹن دبا دیا۔ اور کمرۂ ظلمت کے عدم آباد سے جگمگاہٹ کے وجود میں آپہنچا۔ روشنی چمکتے ہوئے زرنگار پردوں، خوشنما ایرانی غالیچوں، قیمتی شاندار میزوں اور آرام دہ صوفوں پر کھیلنے لگی۔

عاشق مسکرایا۔

پھر بولا "یار سعید۔ کسی طرح ممکن ہو، تو اس تمام ساز و سامان کو بھی اڑا لیں"

سعید اس بیوقت کے مذاق پر چیں بہ جبیں ہو گیا۔ لیکن خاموش رہا۔ اس کی

مشتاق آنکھیں کمرے کی ہر چیز کا بہ امعان نظر مطالعہ کر رہی تھیں۔ چند نگاہوں میں اس نے کمرے کے چپے چپے کا جائزہ لے لیا۔ مختلف الماریوں پر سے اس کی نظریں چھچلتی ہوئی ایک آہنی صندوق پر جم گئیں۔ وہ تیز قدموں سے اس صندوق کی طرف بڑھا۔ جیب سے آلات نکالے اور چند لمحوں میں تالا کھل گیا۔ سعید نے آہستہ سے صندوق کا ڈھکنا اُٹھایا۔

عاشق بھی اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دونوں کے دل دھڑکنے لگے۔ ان کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آئیں۔ اور پھر سعید کے منہ سے ایک کلمۂ استعجاب نکلا۔

صندوق اشرفیوں، زیوروں اور جواہرات سے پٹا پڑا تھا

عاشق بولا "شاید خوش نصیبی مصیبت کی طرح ہجوم کی صورت میں نازل ہوتی ہے"۔ اور یہ فلسفیانہ جملہ کہہ کر اس نے اشرفیوں اور جواہرات کو ایک تھیلے میں بھرنا شروع کیا۔ سعید نے زیوروں پر ہاتھ ڈالا۔ لیکن فوراً ہی عاشق نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور نہایت خشک لہجے میں کہا۔ "انہیں رہنے دو"۔

سعید اس غیر متوقع دخل اندازی سے اس قدر متعجب ہوا۔ کہ اس کے منہ سے غصے اور حیرت کے مخلوط جذبات کے زیر اثر کوئی فقرہ نہ نکل سکا۔ اس نے عاشق

کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھا۔ گویا عاشق کا دماغ پھر گیا ہے۔

پھر کہنے لگا۔ "کیوں؟"

عاشق نے ذرا تیز لہجے میں جواب دیا۔ "کیا یہ باتوں کا موقع ہے۔ اشرفیوں اور جواہرات کو قابو کر کے ۳ بج چکے ہیں۔ وجہ گھر چلکر بتاؤنگا۔"

سعید کو غصہ آگیا۔ اسقدر محنت سے نقب زنی کرنے کے بعد ان بیش قیمت زیوروں سے بیوجہ محروم جانا اسے حماقت کا عروج کہتے ہیں۔ کچھ پاگل ہوئے ہو ان زیوروں۔"

"میں کہتا ہوں۔"

"تم کہتے ہو۔ اس وقت شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تمہاری بات قابل اعتبار نہیں۔"

غصے میں ان دونوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اور انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ کہ ساتھ کے کمرے سے کسی چیز کے حرکت کرنے کی آواز آرہی تھی۔

عاشق بولا۔ "سعید دیکھو۔ یا تو ہم زیوروں کے بغیر جائینگے۔ اگر تم زیوروں کے لے جانے پر اصرار کرو گے۔ تو ہم دونوں میں سے صرف ایک اس مکان سے واپس جائیگا۔"

اس فقرے کے بین السطور میں جو صریح دھمکی پوشیدہ تھی۔ اس نے عاشق کے

تمام حیوانی جذبات کو یک قلم برانگیختہ کر دیا۔ اِس کے ماتھے کی رگیں پھول گئیں۔ اور وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔

اس نے کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو"

عاشق نے ایک نہایت خطرناک سکون سے جواب دیا "بے شک۔ اگر تم اسے ایک دھمکی تصوّر کرتے ہو"

اب دونوں ایک دوسرے کے مقابل سرو قد کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے زور سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور قریب تھا کہ دونوں گتھم گتھا ہو جائیں۔ کہ یکایک عاشق کی نگاہیں کمرے کے سامنے والے دروازے پر جا کر جم گئیں۔ سعید نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک نہایت حسین عورت جسے شاید عورت کہنا بیجا ہوگا۔ کیونکہ ابھی وہ شباب کے اس درجے میں تھی۔ جب کمسنی کی سادگی پر نوجوانی کا فروغ غالب نہیں ہوتا۔ کھڑی تھی۔ وہ شب خواب کا لباس پہنے تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کا لباس جو اس کے دمکتے ہوئے کندنی حسن پر نہایت زیب دے رہا تھا۔ کمرے میں دو اجنبی جوانوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کی سفیدی چھا گئی۔

سعید اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے بڑھا۔ کہ اس جوان لڑکی کی آواز نکلنے سے پیشتر اس کا گلا دبا دے۔ لیکن ابھی وہ ایک قدم نہ بڑھنے پایا تھا۔ کہ عاشق نے اِسے

ایک آہنی گرفت میں پکڑ لیا۔ اب سعید کی وہ دوستی جو سالہا سال کی شرکتِ گناہ پر اپنی زہریلی بنیادوں کو استوار کر چکی تھی۔ اس نئی حماقت اس تازہ جنون کی تاب نہ لا کر ٹوٹ گئی۔ اس نے عاشق کو گلے سے دبوچ لیا۔ اور وہ دونوں فرش پر لوٹنے لگے لڑکی نے اس عجیب منظر کو دیکھ کر ایک جانگداز چیخ ماری۔ اور پھر بیہوش ہو کر گر پڑی اس چیخ نے گویا کمرے کی مہیب خاموشی کو حرکت کے تسلسل میں تبدیل کر دیا ہر طرف سے آوازوں کا ایک ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ قدموں کی چاپ راستوں میں گونجنے لگی۔ اور سعید اور عاشق کو اپنے خطرے کا اس وقت احساس ہوا جب اسی دروازے سے انہیں کئی ایک آدمیوں کی صورتیں روشنی میں پوری طرح متشکل ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ دونوں برق مثال تیزی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پچھلے دروازے سے بھاگ کر مکان سے باہر نکل گئے اور وہ اشرفیاں جواہرات اور زیور جو اس مہیب رات میں گناہ کے محرک ہوئے تھے۔ اس طرح زمین پر بکھری ہوئی جگمگ کرتے رہے۔

(۲)

وہ دونوں سنگ مرمر کی چمکتی ہوئی میز پر کہنیاں ٹیکے ہوئے شراب کے ان بلوریں گلاسوں کی طرف دیکھ رہے تھے جن میں سے ایک شعلۂ رنگ دیو لپک لپک کر ان کے دماغوں کو سرور کے تصورات سے مسحور کر رہا تھا۔ اس کشیدگی

کو جوان میں رات کے واقعہ کی وجہ سے ناگزیر طور پر پیدا ہو گئی تھی، دور کرنے کیلئے اس لعل گداختہ کی طرف رجوع کیا گیا۔

سعید نے اپنے گلاس میں سے آدھی شراب ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا! تو عاشق تمہارا کل کا رویہ کس مصلحت پر مبنی تھا؟"

عاشق نے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ اور قہوہ خانے کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اشارے سے سبک پا اور چابک دست نوکروں میں سے ایک کو آواز دی۔ اور کہا "۔ ایک بوتل شمپین کی اور لاؤ۔ اب ہمیں اور کوئی چیز درکار نہیں ہے۔" اور اُس نے نوکر کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ گویا وہ واضح کر دینا چاہتا تھا۔ کہ اب انکا آنا ان کے لئے ناگوار خاطر ہوگا۔

نوکر بوتل رکھ کر چلا گیا۔ اب دونوں تقریباً تنہا تھے۔ کیونکہ گیارہ کا عمل تھا۔ اور وہ چہل پہل جو قہوہ خانوں میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ رخصت ہو چکی تھی۔

عاشق ابھی تک ٹکٹکی لگائے ہوئے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس نے نہایت فوری طور پر سعید کی طرف آنکھیں پھرائیں گویا کسی خاص فیصلے پر پہنچ کر وہ بہت جلد کسی فرض سے عہدہ برآ ہونا چاہتا تھا۔ اس نے میز کی طرف دیکھتے ہوئے

کہنا شروع کیا۔

"شاید تم باور نہیں کروگے۔ لیکن آج سے پندرہ سال پہلے میری جوانی خوبصورتی سے مُزیّن تھی۔"

اس نے سامنے کے آئینے کی طرف کچھ عجیب انداز میں دیکھا۔

"ابھی جُرم اور گناہ کے تاریک راستوں میں میرا پہلا قدم تھا۔ اور خبث باطن چہرے پر نمایاں نہ ہونے پایا تھا۔ ایک دن مجھے کچھ روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے میں اپنی قسمت آزمائی کرنے کے لئے ایک جوئے خانے کی طرف چلدیا۔ میں وہاں کے مشہور کھلاڑی احمد بخش سے کھیلتا رہا۔ پہلے پہل تقدیر میری یاوری کرتی رہی۔ اور میرے سامنے سونے اور چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں کا انبار لگ گیا۔ لیکن پانسہ پلٹ گیا۔ اور میں نے ہارنا شروع کیا۔ جیتا ہوا روپیہ۔ خود اپنا روپیہ اپنی گھڑی گھڑی کی طلائی زنجیر اپنا گرم کوٹ واسکٹ سب کچھ ہار گیا۔

احمد بخش مسکراتا ہوا اُٹھا۔ اور دروازے میں سے نکل گیا۔ میں بہت عرصہ اس میز کے قریب جہاں میری بربادی کا سامان بہم پہنچا تھا بیٹھا رہا۔ کیونکہ سب کچھ ہار چکنے کے بعد جسمیں میرے آقا کا روپیہ بھی شامل تھا۔ میں قید خانے کی تنگ و تاریک فضا پر موت کی پراسرار مگر لامحدود مملکت کو ترجیح دیتا تھا۔ آخر کار اس بوڑھے جواری نے جوابِ جوئے خانے کا

مالک تھا۔ میرے شانوں پر تھپکی دی۔ میں نے دیکھا۔ کہ وہ ہنس رہا تھا۔ ہنسی کے مارے اس کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ اس وقت میری یہ کیفیت تھی۔ کہ جذبات میں ناکامی کے شعلے کھول رہے تھے۔ اس ہنسی نے انہیں دیا سلائی دکھا دی۔ اور غصے کی آگ اپنی لپیٹ میں عقل و خرد کو جلاتی ہوئی فی الفور بھڑک اُٹھی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں ہنس رہے ہو"

وہ میرے لہجے کی سنجیدگی کو دیکھ کر کچھ خاموش ہو گیا۔ لیکن پھر اسے ہنسی کا دورہ ہوا۔

اب میں بے قابو ہو گیا۔ میں نے اسے گلے سے دبوچ لیا۔ اور کہا۔ اس طرح کہ آواز میرے حلق میں اٹک رہی تھی

"بتا بوڑھے ریچھ کیا بات ہے"

میری گرفت لمحہ بہ لمحہ زبردست ہوتی جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ چہرہ نیلا پڑ گیا۔ اور اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں یہ الفاظ نکلے۔ "مجھے چھوڑ دو۔ بتاتا ہوں"

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی۔

اس نے رکتے ہوئے کہا "احمد بخش تمہیں دھوکا دے گیا ہے۔ اس کے پاس ایک

آئینہ تھا جس کے ذریعے وہ تمہارا ہر ایک پتہ دیکھ سکتا تھا۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور اب خون میرے سر پر سوار ہو گیا۔ میں نے ٹوپی اُٹھائی اور اندھا دھند احمد بخش کے مکان کی طرف بھاگا۔ مجھے احساس نہیں، کہ میں کن راستوں سے وہاں تک پہنچا۔ یا کتنے لوگوں کو میں نے راستے میں اپنے پاؤں میں کچل دیا۔ میرے حواس اس وقت درست ہوئے۔ جب اس کا مکان رات کے بارہ بجے کے قریب ایک مبہم سی ہیئت میں میرے سامنے نمودار ہوا۔ سامنے کے دروازے کا تالا کھول دینا میرے لئے چند لمحوں کا کام تھا۔ میں بلا خوف و خطر احمد بخش کے ذاتی کمرے کی طرف چلا گیا۔ جیبی لالٹین روشن کی۔ میز پر اسی طرح ان اشرفیوں اور نوٹوں کا انبار تھا۔ جو اس نے دھوکا دیکر مجھ جیتے تھے۔ اب میں نے اطمینان سے بتی جلادی۔ اور پھر سعید میں نے آسمان کا ایک ستارہ زمین پر جلوہ گر دیکھا۔"

کچھ لمحوں کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ تاکہ سعید اس کے فقرے کی تمام اہمیت کو اپنے دماغ میں جذب کر سکے۔ پھر بولا۔" میں نے عرصے سے احمد بخش کی تعلیم یافتہ لڑکی کی تعریف سنی تھی۔ آج میں نے اسے دروازے میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ عین اسی طرح جس طرح کلرک اس معصوم لڑکی کو دیکھا۔ سعید میں اسے عورت کہونگا۔ کیونکہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں۔ کہ میں اسکے حسن کی تعریف کر سکوں۔ اگر میں اسے دیوی کہوں تو شاید اسے بناوٹ

پر محمول کیا جائیگا۔ اس کا قد معمول سے زیادہ بلند تھا۔ اور اسکے بال سنہری تھے۔ اسکی خوبصورتی اس قسم کی خوبصورتی تھی جسے یونانی حسن کہتے ہیں۔ اور اس کے انداز میں وہ بات موجود تھی۔ جو انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہے۔ یعنی تھک جانے کا احساس۔ اور میں دیکھ رہا تھا۔ کہ اسکی آنکھیں اسکے نقش و نگار میں سب سے زیادہ اہم چیز تھیں۔ کیونکہ ان میں وہ بات تھی۔ جس کی تحلیل نہ ڈراما نویس کر سکتے تھے۔ نہ افسانہ نگار کر سکتے ہیں۔ خوابیدہ جذبات کی وہ چمک جو صرف ایک تعلیم یافتہ اور صاحب ذوق سلیم کی نگاہوں میں پائی جا سکتی ہے۔ اس نے میری طرف جذبات سے معرّا نگاہوں سے دیکھا معمولی عورتوں کی طرح اس نے چیخنے یا غش کھا کر گر جانے کی کوشش نہیں کی۔ پھر ایک ایسی آواز میں گویا موسیقی کی ایک ہلکی سی اور فضا کو ترنم سے مدہوش کر رہی ہو۔ کہنے لگی۔

"چور"۔

میں نے اپنا سر جھکا لیا۔

وہ مسکرائی اور تھوڑا عرصہ خاموش رہی۔ اس کے انداز میں خوف کا ذرا سا شائبہ بھی نہ تھا۔ لیکن اس کی خاموشی انتہا درجہ کی معنی خیز تھی۔ شاید اس نے مسکراہٹ کو فن لطیف کے طور پر حاصل کیا تھا۔ کیونکہ جو الفاظ اسکی زبان ادا نہ کر سکی تھی۔ یا نہ کرتی تھی اسے وہ تبسم کے ذریعے ناظر کے ذہن پر نقش کر دیتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے

نظروں ہی نظروں میں مجھے بھانپ لیا۔ کیونکہ وہ پھر مسکراتے ہوئے۔ بولی، "آپ عادی چور نہیں معلوم ہوتے۔"

اس آپ کے لفظ نے میری رگوں میں خون کا ایک مجنونانہ رقص پیدا کر دیا۔ "آپ آپ۔ آپ۔"

میں نے یہ لفظ کئی بار اپنے دل میں دہرایا۔

"اس عزت افزائی کا ممنون ہوں۔ بیشک میں عادی چور نہیں۔"

وہ پھر مسکرائی۔ اور اب یہ مسکراہٹ استفہامیہ تھی یعنی وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی)۔ اگر یہ بات صحیح ہے۔ تو میری موجودگی وہاں کیا معنی رکھتی ہے۔

تھوڑا عرصہ میں خاموش رہا۔ ذرا اور میرے قریب آگئی میری طرف غور سے دیکھا اور اب میں نے سب سے پہلی دفعہ اس کے چہرے پر کسی جذبے کے آثار دیکھے۔

تم شاید نہیں مانو گے لیکن سعید سچ کہتا ہوں۔ کہ اس کے رخسار شرم سے تمتما رہے تھے۔ میں تمہیں یقین دلاتا۔ کہ محبت بیک نظر کا مقولہ خطرناک طور پر صحیح ہے۔ میں اس عورت سے پہلی ہی نگاہ میں محبت کرنے لگ گیا تھا۔ اور کیا تم باور کرو گے۔ جب میں تمہیں یہ کہوں کہ اسکی مسکراہٹ الفاظ سے زیادہ صریح اشاروں سے زبان واضح گفتگو سے زیادہ مفصل انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔ کہ "میں تم سے محبت

کرتی ہوں۔"

میں نے اضطراب کے ایک عجیب لہجے میں اپنے روپے کی ضرورت احمد بخش سے کھیلنا۔ ہار جانا۔ اور شیشے کی دھوکا دہی کا تمام حال تقریر کے ایک ہی حصّے میں سنا دیا۔

اب وہ سنجیدہ ہو گئی۔ اور اس نے ان اشرفیوں اور نوٹوں کے ڈھیر کیطرف دیکھا۔ جو میز پر پڑے ہوئے تھے۔

میں نے خاموشی کو حوصلہ شکن پا کر کہا۔ "اس لئے میں یہاں آیا تھا۔ ان روپوں اور اشرفیوں کے لئے۔"

اور میں نے اپنے ہاتھ سے میز کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے میری طرف ایک عجیب انداز سے دیکھا۔

پھر آہستہ آہستہ چلکر میز کے قریب آئی اور اشرفیوں اور نوٹوں کو نہایت عجلت سے اُٹھا کر کھلی ہوئی کھڑکی میں سے بازار میں پھینک دیا۔ میں متعجب ہو گیا لیکن میرا استعجاب فوراً رفع ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ پھر مسکرا رہی تھی۔ اور زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے بہت قریب جتنے کہ اسکے بالوں کی ایک آوارہ سی خوشبو میرے دماغ تک پہنچ رہی تھی۔ اور اسکا انداز تبسّم کہہ رہا تھا۔ تم ان کے لئے

آئے تھے۔ تم ان کے لئے آئے تھے۔

اس سے زیادہ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ اب اس نے الفاظ کی ضرورت محسوس کی۔

کہنے لگی۔ "اب تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔"

لیکن اب وہ مسکرائی نہیں۔

حقیقت کی شمع یکایک میرے سینے میں روشن ہو گئی۔ وہ اس بات پر ناراض تھی۔ کہ میں صرف روپے اور اشرفیوں کے لئے اس کے ہاں آیا تھا۔ اور اس کی خوبصورتی کی موجودگی میں روپوں کا ذکر کر سکتا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اب تمہارے لئے ٹھہرا ہوں۔"

اس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس انداز سے بیٹھ گئی۔ گویا اسے دنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔ گویا اس نے میرے وجود کو فراموش کر دیا۔ میں نے ہمت کی۔ صوفے کے ذرا قریب ہو گیا۔

"اب میں آپ کے لئے ٹھہرا ہوں۔"

"اب آپ ہمیشہ میرے دل میں ٹھہرے رہیں گے۔"

یہ کہکر وہ اُٹھی۔ اور واپس جانے لگی۔ لیکن راستے میں تقدیر احمد اور پولیس کے

چار کانسٹیبلوں کی صورت میں راہ روکے ہوئے کھڑی تھی۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس وقت اس مسکراہٹ کے معنی مجھ پر روشن نہ ہوئے۔ اب کہ محبت روگ ہو گئی ہے۔ میں اس مسکراہٹ کے معنی سمجھ سکتا ہوں۔ اس میں محبت کا انتہائی کمال موجزن تھا۔ اس میں قربانی کی طاقت لرزاں تھی۔

احمد بخش چلا کر کہہ رہا تھا: "یہ چور ہے۔ چور ہے۔ اسے پکڑ لو"

پولیس کے کانسٹیبل میری طرف بڑھے۔ لیکن وہ فطرت کی بہترین تخلیق میرے اور ان کے درمیان ایک آہنی دیوار بنکر حائل ہو گئی۔

اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اور حیرت کے لہجے میں بولی۔ "ابا یہ چور نہیں! میں نے تو آج انہیں خود بلایا تھا"

احمد بخش اپنی بیٹی کی طرف سے توہین وتذلیل کی اس آخری صورت کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے گرج کر کہا۔

"تم نے اسے بلایا تھا"

جواب دینے سے پیشتر اس نے میری طرف دیکھا۔ اور اب اس کی نگاہ مسکراہٹ سے زیادہ معنی خیز تھی۔

اس کی نگاہ میں عشق کی ناکامیابی لرز رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ مجھے کبھی نہ پا سکے گی۔ کہ میں اس کے لئے شجر ممنوع کا حکم رکھتا ہوں۔

سعید تم نہیں جانتے۔ کہ جب ایک عورت کو یہ شبہ ہو جائے۔ کہ وہ کسی مرد کو نہیں پا سکے گی، یا کسی مرد پر اس کا قابو کم ہو چلا ہے۔ تو دلبری اور دلستانی کی وہ کونسی ادائیں ہیں۔ جو اس پر صرف نہ کر دیگی۔ قربانی کا وہ کونسا عروج ہے۔ جس پر وہ اس کے لیے پہونچ کر نہ رہیگی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "بیشک میں نے انہیں بلایا تھا۔ اور میں انہیں پیار کرتی ہوں۔"

وہ اس پیار کا اعتراف الفاظ میں کبھی نہ کرتی۔ لیکن اسے معلوم تھا۔ کہ اس کے بعد وہ مجھ سے کبھی نہ ملیگی۔ اور اس کے بعد وہ کبھی میری صورت نہ دیکھے گی۔ اور اس چھوٹے سے اعتراف میں محبت کی تمام دلفروز رنگینیاں پوشیدہ تھیں۔

احمد بخش نے کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا۔ وہ اب کیا کر سکتے تھے۔ واپس چلے گئے۔ اور پیشتر اس کے کہ میں اپنے حواس درست کروں۔ اس نے جیب سے ایک شکاری چاقو نکالا۔ اور اپنی لڑکی کے سینے میں بھونک دیا۔ اب مجھے ہر طرف خون ہی خون نظر آتا تھا۔"

اس نے سعید کی طرف دیکھا۔ اور اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا

"میں نے انہی دونوں ہاتھوں سے احمد بخش کا گلا گھونٹ دیا۔ اسے گھونٹ گھونٹ کر مار ڈالا۔ اور یوں میری جرم کی زندگی شروع ہوئی۔ کیا اب تم اس بات پر حیران ہو سکتے ہو۔ میں عورتوں کے زیور کو کیوں ہاتھ نہیں لگاتا۔"

سعید خاموش رہا۔ اس بات کا جواب سوائے خاموشی کے کیا تھا

صبح و شام

کبھی عیش و وصل کی صبح ہے
کبھی رنج ہجر کی شام ہے

صبح و شام

ہم ماحول کو متاثر ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ماحول سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔

(ہارڈی)

جس طرح فطرت کے مظاہر میں دھوپ چھاؤں صبح و شام ہے۔ اسی طرح انسانی رُوح کی کیفیات میں بھی صبح و شام دھوپ چھاؤں ہے۔

(ایک قدیم چینی مصنف)

(۱)

تاریک بارانی رات۔ سرد ہوا کے جھکڑ۔ بارش کی بوچھاڑ ——— دور افق پر بجلی کی سنہری لکیریں۔ مریخ کے آتشیں زبانے۔ آگ کے سانپ۔

وہ ان سب چیزوں کی ہیئت کو محسوس کرتا ہے۔ لیکن اُس کی کسی حرکت سے اس احساس کا اظہار نہیں ہوتا۔ خاموش ایک آرام کرسی پر لیٹا ہے۔ آنکھیں نیم وا۔ ایک

ہاتھ گال پر رکھے۔ آتشدان میں لکڑیاں جلنے کی آواز اسے محسوس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں ہوتی آتشدان سے ایک شعلہ بلند ہوتا ہے۔ اور اس کے چہرے کو روشن کر دیتا ہے۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ گڑھے ہیں۔ ہونٹ بالکل سفید۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے اضطراب کے کتنے دوزخوں میں سے گذر کر یہ سکون حاصل ہوا ہے۔

ایک مجروح و مذبوح تبسم کا اثر اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہے۔ تو یہ سب جھوٹ تھا۔ فریب! دھوکا۔ اس نے کتنی بار اپنے دلکو سمجھایا تھا۔ نادان! التفات پر نہ جا ہائے معصوم دل ——

تو یہ سب کچھ اُسے بے قصور مار ڈالنے کے لئے مار رکھنے کے لئے تھا! تو وہ چاندنی رات خواب تھی! لیکن کسقدر شیریں خواب! چاندنی کسقدر دل افروز تھی! فضا گرد و غبار سے پاک نیلا نیلا بے داغ آسمان۔ اُجلی اُجلی دنیا۔ ایک حسین کا فرہ تھی۔ نور میں نہا کر اُٹھی تھی ہائے وہ چاندنی رات۔ اس نے کس پیار سے چاند کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا "پیارے چلو چاند کی کشتی میں بیٹھ کر آسمان کے نیلے سمندر کی سیر کریں۔ اور اتنی دور چلے جائیں کہ کھو جائیں۔ کہکشاں کی نوریں فضا میں گم ہو جائیں۔ اس دنیا کی دھندلی فضا میں پھر سانس نہ لیں پھر واپس نہ آئیں "

تو یہ سب دھوکا تھا! ہائے عورت! تجھے یہ فریب دیکر کیا حاصل ہوا۔ کیا مجھے

پھسل کر تیرے خرام ناز میں زیادہ دلکشی پیدا ہو گئی۔ اُس نے کرسی پر پہلو بدلا۔ سامنے الماری میں کتابیں دیکھ کر اسے براؤننگ کے شعر یاد آ گئے۔

"میرا دل اُس کے پائے ناز سے کچلا گیا ——————"

اور اُس کے پائے ناز کی کیا خطا!

میرے دل کا قصور ہے)

"وہ اسکی رفتارِ ناز کی راہ میں کیوں آیا تھا کہ کچلا گیا"

یکایک مکان کانپنے لگا۔ تصویریں دیواروں کے ساتھ ٹکرانے لگیں۔ کہیں نزدیک بجلی تڑ تڑا کر گری۔ کھڑکیوں کے دروازے چیخ کر ٹوٹ گئے۔ زلزلہ اور بجلی اور وہ کرسی پر لیٹا خاموش دیکھتا اور سنتا رہا ——————— بوچھاڑ کی آواز زیادہ گہری تیز اور خوفناک ہو گئی

اس نے کرسی پر پھر پہلو بدلا ——————— ایک لمحے کے لئے اس کی توجہ فطرت کے عناصر کی خوفناک جنگ کی طرف ہوئی تھی۔ اب پھر ——————— تو وہ دن ——————— شاید وہ میرے خیال کا غبار ہیں۔ شاید کوئی جیتی جاگتی عورت نہیں میری تمناؤں اور آرزوؤں کا مجسمہ ہے۔ میرے ذہن کی تخلیق ہے۔ شاید وہ ایک بت ہے جسے میرے ہاتھوں نے تراشا ہے۔ اور جسے میں جاندار سمجھنے لگا ہوں ——————— وہ بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

توجس طرح میں نے اس بُت کو تراشا ہے میں اسے برباد بھی کر سکتا ہوں حقیقت کی ایک ضرب اس وہم کو پارہ پارہ کر دینے کے لئے کافی ہے —— میں اس بت کو توڑ دونگا۔ فنا کر دونگا۔

اب وہ کمرے میں دیوانہ وار تیز تیز اِدھر اُدھر پھر رہا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ قدم سست ہو جاتے ہیں۔ سر جھک جاتا ہے۔ —— کھڑکی کے پاس کھڑا ہے۔ مُنہ پہ بارش کے چھینٹے پڑ رہے ہیں۔ رو رہا ہے۔ گرم گرم آنسو۔ گالوں پر بہ رہے ہیں۔ غصہ مِٹ چکا ہے۔ پھر وہی ناکامی اور مایوسی کا احساس ——

ہائے! کسطرح کہوں کہ وہ دن خواب تھے۔ ابھی آنکھوں کے آگے وہ منظر ہے جاتے وقت اس نے کس حسرت سے کہا تھا! پیارے خط کا جواب دوگے نا! ان چند لفظوں میں کتنے ایما تھے کتنے اشارے تھے۔ گویا میں خط کا جواب نہ لکھونگا۔ مردکی بیوفائی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ یہ فریب تھا۔ کس طرح مانوں۔ میری چھوٹی ٹی خفگی پر اس نے کس کس طرح مجھے منایا ہے۔ کس طرح ہاتھ جوڑے ہیں ——

یہ سوچتا ہوا وہ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اضطراب زیادہ ہو چکا تھا۔

فریب نہ تھا! وہ سچی تھی۔ تو پھر اس خاموشی کے کیا معنی ہیں! آج اسے گئے ہوئے

بیس دن ہو گئے۔ خط کا ایک پرزہ نہیں۔ اس قدر مصروفیت ——

مصروفیت کیسی؟ بے پروائی۔ تغافل۔ نہیں تغافل نہیں۔ ارادۃً جان بوجھ کر خاموشی!

فریب دھوکا ——

اب غصّے سے بیتاب ہے۔ اپنے بال نوچ رہا ہے۔ ناخن گالوں میں گڑو دیئے ہیں —— چیخ چیخ کر رہا ہے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز آتی ہے۔ بارش پھر تیز ہو گئی —— تھک گیا۔ کرسی پہ گر گیا ہے ——

آنکھ لگ گئی ہے۔

صبح: آسمان نیل گوں بے داغ۔ دنیا نہائی ہوئی اجلی سفید۔ ٹھنڈی ہوا۔

سورج کی حدت خوش گوار ——

وہ کرسی پر سے اٹھا۔ رات کا مصیبت ناک منظر فراموش کر چکا ہے۔ دن کا خوشگوار اثر محسوس کرتا ہے۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکتا ہے۔ ڈاکیہ آرہا ہے۔ ہاں اسی طرف آرہا ہے۔ ہاتھ میں خط ہے۔ لیٹر بکس میں ڈال دیا —— اطمینان

کا سانس لیتا ہے۔

بارِ الٰہا تیرا شکر ہے۔

ابھی ہمت نہیں کہ نیچے اترے۔ کرسی پر بیٹھا ہوا مسکرا رہا ہے۔